یادوں کی
پرچھائیاں
رحمت امروہوی

رحمت امروہوی

ناشر: رحمت امروہوی، مرزاپور، مورکس واڑہ۔ احمد آباد

اس کتاب کی اشاعت میں گجرات ساہتیہ اکادمی۔ حکومت گجرات گاندھی نگر کا جزوی مالی تعاون شامل ہے۔

تقسیم کار:

صدر دفتر:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی 110025

شاخیں:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار، دہلی 110006

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ۔ بمبئی 400003

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونی ورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ 202001

پہلی بار ۶۸۶ تعداد 750 قیمت =/40

برقی آرٹ پریس (پروپرائٹرز: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی میں طبع ہوئی۔

انتساب

حضرت رازؔ صدیقی شاہجہاں پوری مرحوم

کے نام

شکل ظاہر کچھ بھی ہو جائے وہی رہتے ہیں ہم
ہم کہیں بھی ہوں مگر امروہوی رہتے ہیں ہم

رئیس امروہوی

فہرست

پیش لفظ

گجرات ابتدا سے مال و دولت اور جاہ و ثروت کے لیے اپنا مقام رکھتا ہے۔ تاریخ ہند میں یہ علاقہ ذہنی و روحانی اقدار کے لیے بلند درجہ رکھتا ہے۔ اسی طرح علم و ادب کی تاریخ میں بھی گجرات کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ قدیم زبانوں سنسکرت، پراکرت، اپبھرنش کی صحیح نمایندہ زبان گجراتی اسی علاقے سے تعلق رکھتی ہے۔ ہندو ناگری رسم الخط گجرات ہی نے دیا ہے۔ قدیم زبانوں کا اوّلین نجومی ہیم چندر گجرات ہی سے تعلق رکھتا ہے جو راجا سدھ راج جے سنگھ (۱۰۹۴ء تا ۱۱۴۲ء) کے دربار سے منسلک تھا۔ اسی کے عہد سے گجراتی (جدید) کے دورِ اوّلین کا آغاز ہوا تھا۔

سیاسی اُلٹ پھیر میں راج پاٹ ایک خاندان اور ایک قوم سے دوسرے خاندان اور دوسری قوم میں منتقل ہوتا رہا۔ ۱۲۹۶ء میں علاء الدین خلجی کے قبض و تصرف میں گجرات آگیا۔ اس کے چار پانچ صدیوں قبل سے عرب، ایرانی تجارت کے سلسلے میں یہاں آئے اور ایسے جم کر بیٹھے کہ مر کر بھی نہ اُٹھے۔ ان کی زبانوں یعنی عربی فارسی سے مقامی زبانوں کے ملنے سے ایک بازاری زبان رائج ہوگئی تھی۔ اوّلین دور کی گجراتی میں عربی فارسی الفاظ کا دخل عمل بھی شروع ہو چکا تھا۔

خلجیوں اور تغلقوں کے بعد ۸۱۰ھ سے سلاطین گجرات کا دور شروع ہوا۔ یہ عہد علوم و فنون اور اُردو زبان و ادب کے لیے خصوصی طور پر مبارک ثابت ہوا۔ احمد آباد میں بڑے بڑے مدرسے علم کی روشنی پھیلا رہے تھے۔ علوم عقلی و نقلی میں احمد آباد نے بلند درجہ علماء دُنیائے اسلام کو دیے ہیں۔ قرآن کے ترجمے کی تحریک شمالی ہند میں شروع ہوئی مگر جب گجرات کے دینی علوم کا جائزہ لیا جاتا ہے تو شمال سے پہلے ہی گجرات میں قرآن کا ترجمہ ہو چکا تھا[1]۔ ہند میں کتب تواریخ فارسی میں لکھی گئی ہیں۔ گجرات میں دو عربی کتب تواریخ بھی پائی جاتی ہیں[2]۔ لغت نویسی میں شمال میں متعدد کتابیں مرتب کی گئی ہیں مگر گجرات میں بھی ایسی ایک تصنیف بحر الفضائل کے نام سے یادگار ہے۔ اس کے مصنف فضل الدین محمد بن قوام باشندۂ قصبہ کڑی ہیں اور سنہ تصنیف ۱۴۳۳ء/۸۳۶ھ ہے[3]۔

اُردو زبان و ادب کے لیے تو گجرات مہد کا حکم رکھتا ہے۔ گجرات کی گجری کا چشمہ یہاں پھوٹا، بازاروں میں اشیائے تجارت کے ساتھ ساتھ عربی، فارسی اور مقامی زبانوں سے مل کر لفظوں، ترکیبوں کا خوب لین دین ہوتا رہا۔ یہی بولی عوام کے اظہارِ خیال کی ضرورت پوری کرنے لگی۔ پندرھویں صدی میں گجراتی زبان کا نیا دور شروع ہوا تو اس کے مقابلے میں گجری بھی ترقی کی دوڑ میں شریک ہو گئی۔ یہی وہ زمانہ ہے جب کہ صوفیائے کرام نے گجری کو ادبی

---

[1] انگریزی مضمون از پروفیسر ڈار صاحب

[2] پروفیسر ڈار صاحب کلچرل ایکٹیویٹیز انڈر خلجی اینڈ سلطانز آف گجرات۔

[3] پروفیسر محمود شیرانی۔

شکل دے کر بولی سے زبان کے درجے پر پہنچا دیا۔ یا جن متوفیٰ ۹۱۲ھ گام دھنی متوفیٰ ۹۷۳ھ قاضی محمود دریائی متوفیٰ ۹۴۳ھ خوب محمد چشتی متوفی ۱۰۲۳ھ نے گجری میں مستقل تصانیف یادگار چھوڑی ہیں، صوفیا کے بعد تقریباً پچاس سال تک کوئی ان کے درجے کا صوفی شاعر نہیں گزرا۔ گو دینی رجحان رکھنے والے شعراء نے مذہبی مثنویاں یادگار چھوڑی ہیں[1]۔ یہ عہد دکن میں صنفِ مثنوی کے لیے سنہری دور تھا۔ گجرات اس ادبی تحریک سے بھی متاثر تھا۔

۱۷ویں صدی عیسوی اور گیارھویں صدی ہجری کے اواخر میں مجتہد العصر شاعر ولی ادبی افق پر نمودار ہوا۔ ولی کی غیر معمولی شخصیت میں بے شمار خوبیاں تھیں۔ وہ علوم متداولہ میں مہارت رکھتا تھا، صوفی منش انسان تھا۔ فارسی عربی میں مہارت تامہ رکھتا تھا، صاحب ذوق شاعر تھا اور اس کی سب سے بڑی خوبی ایک عظیم انسان تھا جو یک جہتی دیگانگت کا پرچار کر کے وحدت میں کثرت اور کثرت میں وحدت کے تماشے دکھلاتا تھا۔ اس نے اپنے مشن کو پورا کرنے کے لیے صنفِ غزل کو اپنایا تھا۔ ولی کے سامنے دکھنی ادب موجود تھا۔ اس دور کے زبان و ادب اس کے بلند ذوق سے میل نہیں کھاتے تھے لہٰذا اس نے اپنی اجتہادی صلاحیتوں اور علمی ادبی لیاقتوں سے کام لے کر زبان میں جدت سے کام لیا اور غزل کو زبان و خیال دونوں کے اعتبار سے ایک نئے روپ میں پیش کیا۔ یہ روپ شمال میں بہت مقبول ہوا اور اصحاب ذوق کو اُردو زبان کی وسعتوں کا اندازہ ہو گیا۔ اس طرح جنوب و شمال میں صنفِ غزل مقبول ترین صنف ثابت ہوئی۔ اس عہد آفریں شاعر نے ۱۷۰۹ء/۱۱۱۹ھ میں وفات پائی۔ گجرات میں اس کے ہمعصروں اور شاگردوں فراقی، اشرف، رضی، احمد، ثنار وغیرہ نے ولی کے جلائے ہوئے چراغ کو روشن رکھا۔

ولی کے بعد گجرات میں ایک اُستاد شاعر عزلت گزرے ہیں۔ سورت ان کا وطن تھا۔ میر سے ان کے دوستانہ مراسم تھے۔ عزلت عالم ہونے کے علاوہ فنونِ لطیفہ، مصوری، خطاطی، شاعری میں بھی یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔ ۱۷۰۰ تا ۱۸۵۰ء گجرات میں رؤسا و امراء نے اُردو زبان و

---

[1] دیکھیے سخنورانِ گجرات۔

ادب کی بہت کشادہ دلی سے سرپرستی کی۔ ان میں سے بیشتر خود شاعر تھے. جس طرح شمال میں چھوٹے بڑے رئیسوں اور امیروں کے درباروں سے شعرا منسلک تھے اسی طرح گجرات میں بھی شعرا درباروں اور امیروں کی مجالس میں احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے. غزل گوئی اگرچہ جنوب وشمال میں مقبول عام صنفِ سخن تھی تاہم گجرات میں مذہبی مثنویاں چودھویں صدی ہجری کے ابتدا تک لکھی پائی جاتی ہیں. صاف ستھری غزل کی زبان رواج پا چکی تھی مگر مثنویوں میں عوامی بول چال کی زبان استعمال کی جاتی تھی کیونکہ ان کا مقصد دین ومذہب کی تبلیغ سے زیادہ کچھ نہ تھا.

۱۸۵۰ تا ۱۹۵۰ء انقلابات کی صدی تھی. تاریخ شاہد ہے کہ اس دور میں سیاسی، سماجی، مذہبی، ادبی تحریکیں چلائی گئیں. ہندو قوم میں تو انیسویں صدی کے اوائل ہی سے دوڑ دھوپ شروع ہو چکی تھی مگر مسلمان ذرا دیر میں جاگے. سرسیّد اور ان کے رفقائے کار سیاسی، سماجی، ادبی میدانوں میں رواں دواں تھے. ہر ایک نے ایک مورچہ سنبھال لیا تھا. حالی انسانیت دوست تھے. ان کی فطرت حقیقت پسند تھی. انھوں نے اُردو شاعری میں اجتہاد سے کام لیا اور نثر نیز نظم کے ذریعے انقلاب آفریں مشورے پیش کیے. غالب کی اُردو نثر میں جدت طرازیاں اسی انقلاب کا پیش خیمہ تھیں. غرض سرسیّد، حالی، نذیر احمد، شبلی وغیرہ نے اپنی ادبی کاوشوں سے ایک نئے دور کا آغاز کر دیا. ابھی اس کو پچاس سال ہی گزرے تھے کہ ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک کا آغاز ہو گیا اور اس کے پچیس تیس سال بعد جدیدیت کا رجحان سامنے آ گیا.

گجرات میں رؤسا وامرا کی اُردو دوستی اور سرپرستی اور دوسرے شمالی ہند کی اُردو تحریکوں سے گجرات میں شعر وسخن کا کافی چرچا رہا. سورت، بھروچ، بڑودہ، احمد آباد وغیرہ میں کئی بلند درجہ شاعر پائے جاتے ہیں. سورت کے منشی میاں داد خاں سیاح شاگرد غالب، مجھو اور شاگرد منظور، علوی، وکا ایک اَن پڑھ شاعر، رفعت، سید منعم بھروچ کے فائق مرتب تذکرۂ مخزن شعرا، اعجاز بڑودہ کے وفا شاگرد غالب، فدا شاگرد غالب، صدر سرسیّد اور حالی کے صحیح نمایندے، افسر پسر فدا، احمد آباد کے حسن، سہیل، مکتر، نسیم وغیرہ اس دور

کے قابلِ ذکر شاعر ہیں[۱].

۱۹۴۲ء تا ۱۹۴۸ء میں گجرات کالج، احمد آباد میں بطور لکچرار خدمت انجام دے رہا تھا. اگرچہ دورِ قیام بہت مختصر تھا لیکن احمد آباد کی ادبی محفلوں، عام مشاعروں وغیرہ کا رنگ ڈھنگ دیکھنے کے کافی موقعے میسّر آئے. چالیس سال کے بعد ذہن پر زور دینے کے بعد چند باتیں یاد آئی ہیں جن کا ذکر یہاں بے محل نہ ہوگا.

احمد آباد میں مخصوص مشاعرے اکثر ہوتے رہتے تھے. ان میں مخصوص شعرا شرکت کرتے تھے. ۱۹۴۲ء میں ایسی ہی ایک مخصوص نشست میں مجھے بطور صدر یاد کیا گیا تھا. اس میں حکیم سیّد احمد دہلوی اور سیّد فخرالدین فخر نے شرکت کی تھی. فخر صاحب نے ایک شعر ایسا پڑھا جس میں اپنے آپ کو بلبل سے تشبیہ دی تھی. شعر پڑھنا تھا کہ حکیم صاحب نے کہا ہم تو یہی سمجھتے تھے، کہیں سے آواز آئی بلبل کی توہین ہے. کسی نے کچھ اور پھبتی کہی. غرض بزمِ مشاعرہ زعفران زار بن گئی. ۴۴-۱۹۴۳ء میں ماہر القادری کی آمد پر ایک عام مشاعرہ منعقد کیا گیا تھا. اس کی صدارت کے فرائض مجھے انجام دینے پڑے تھے. ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا. بوڑھے اور جوان شاعر اپنی اپنی فن کاری کے نمونے پیش کرنے کے لیے بے تاب تھے. ایک جوان شاعر غزل پڑھنے مائک پر آئے. جوان شاعر نے اعلان کیا کہ وہ رباعی پیش کرتے ہیں. مگر انھوں نے قطعہ پڑھ دیا. ماہر صاحب نے مجھ سے کہا یہ تو قطعہ ہے. میں مسکرا دیا. ماہر صاحب سے ضبط نہ ہوا. جوان سے کہا کہ وہ قطعہ ہے رُباعی نہیں. جوان نے جواب دیا اس کو قطعہ کہیے یا رُباعی، جو جی چاہے وہ کہہ لیجیے.

رحمت صاحب نے اپنی تالیف "یادوں کی پرچھائیاں" میں جن شعرا کا ذکر کیا ہے ان میں سے بیشتر سے میں ذاتی طور پر واقف تھا. سیّد فخرالدین فخر، فخرِ گجرات کہے جاتے تھے. کہنہ مشق اُستاد تھے. ان کے شاگردوں کا زمرہ بہت بڑا تھا. روایتی شاعری کے پابند تھے. وہ ایک مشائخ خاندان سے تعلق رکھتے تھے. حضرت غوث سیّد عبدالقادر جیلانی کی شان

---

[۱] تفصیل کے لیے دیکھیے سخنورانِ گجرات.

میں چند قصیدے کہے تھے۔ اس پر پیش لفظ مجھ سے لکھوایا تھا۔ اس کام کے لیے وہ خود بمبئی آئے تھے۔ چونکہ میں اسماعیل کالج بمبئی جا چکا تھا۔ بمبئی میں انھوں نے قیام کیا اور تین چار روز میں مجھ سے لکھوا کر لے گئے۔ گویا مشین میں پیش لفظ تیار کرایا جو میری فطرت سے بعید ہے مگر ان کی بزرگی کا لحاظ کرتے ہوئے میں نے اس خدمت کو جلد انجام دے دیا۔ ایک دفعہ سورت میں بمقام نواب محل شاندار عام مشاعرہ منعقد ہوا تھا۔ اس کے صدر جناب افسر بڑودہ سے تشریف لائے تھے۔ مصرع طرح تو یاد نہیں قافیہ دل، بسمل وغیرہ تھا۔ فخر صاحب سے سہو ہوا اور مُہمَل کو مُہمِل باندھ گئے۔ میرے استاد محمد صادق صاحب نے داد میں اتنا کہا "کیا مُہمَل ہے" کلیم صاحب مجذوب قسم کے شخص تھے مگر شاعرانہ فن کاری میں بہت باہوش تھے۔ زخمی صاحب زندہ دل شخص تھے۔ رہنے والے گڑگاواں کے تھے مگر احمد آباد میں مستقل اقامت اختیار کر لی تھی۔ ان کے لہجے میں کبھی کبھی صوبائی خواص جھلک جاتے تھے۔ اکثر دیوان بنگلے میں سید مصطفےٰ احسن صاحب قادری، سید جمال الدین صاحب قادری وکیل ڈار صاحب اور میں مل بیٹھتے تو گھنٹوں صحبت رہتی۔ طبیعت میں تعلّی تھی اور دہلوی لہجے میں گفتگو کرتے تھے۔ جمیل ابن کلیم سے بھی ملاقات تھی۔ جمیل ترقی پسند رجحان رکھتے تھے۔ حضرت عیسیٰ خان افغان تھے۔ ان سے سرراہے ملاقات ہو جاتی تھی۔ ایک دفعہ عیدالفطر کے موقع پر میں ڈار صاحب اور جمال الدین ان کے گھر پہنچ گئے۔ ڈار صاحب نے ان سے بر سبیلِ تذکرہ دریافت کیا "نثر صاحب آپ کے کتنے بچے ہیں؟" تو جواب دیا "ابھی تو میں خود بچہ ہوں"۔ ایک عید پر ٹاٹ کے کپڑے پہن کر شہر میں پھرتے رہے۔ زیرِ بحث کتاب میں مذکور تقریباً تمام شعرا سے میری ملاقات تھی۔

۱۹۴۸ء میں جبکہ اُردو کے چاہنے والے سیاسی حالات کی وجہ سے سہمے ہوئے تھے اور اُردو کا نام لینے سے بھی ڈرتے تھے۔ ان حالات میں انجمن ترقی اُردو کی جانب سے کُل گجرات اُردو کانفرنس منعقد کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ خیال کو عملی جامہ پہنایا گیا اور مارچ ۴۸ء میں کانفرنس کا انعقاد عمل میں آیا۔ ڈاکٹر عبدالحق صاحب کراچی سے صدارت کے لیے تشریف لائے تھے اور دہلی سے پنڈت برج موہن صاحب کیفی نے مُشاعرے کی صدارت

کے فرائض انجام دیے۔ دونوں بزرگوں کے قیام کا انتظام غریب خانہ پر تھا۔ ایسے میں جب کبھی دلّی جاتا تو مولوی صاحب ہی کی کوٹھی پر قیام رہتا اور بہت کچھ سیکھنے کے موقعے ملے مگر بزرگوں کے اس چار روزہ قیام اور ان کی خدمت و صحبت سے جو باتیں سیکھ لیں وہ بہت اہمیت رکھتی ہیں[1]۔

مولوی صاحب نے خطبۂ صدارت پڑھنا شروع ہی کیا تھا کہ خطبے کی چھپی ہوئی نقلیں تقسیم کرنا شروع ہوا۔ کاغذوں کی کڑکڑ آواز سے خلل پڑ رہا تھا۔ وکیل جمال الدین صاحب نے مولوی صاحب سے عرض کیا کہ دو منٹ رُک جائیں تو یہ تقسیم کر دیا جائے۔ مولوی صاحب بگڑ کر بیٹھ گئے اور کہا اب میں نہیں پڑھتا۔ معاملہ گمبھیر ہو گیا۔ میں نے لوگوں سے کہا "آواز دو، مولوی صاحب خطبہ پڑھیے"۔ مولوی صاحب کھڑے ہو گئے اور خطبہ پڑھ دیا۔ اسی طرح دوسرے روز مشاعرہ میں کیفی صاحب اپنی بیاض گھر بھول آئے تھے۔ مجھے حکم ہوا کہ میرے کمرے میں فلاں کتابوں کے نیچے فلاں بیاض ہے وہ لے آیئے۔ جب مشاعرہ گاہ میں پہنچا تو مجھے حکم ہوا فلاں فلاں صفحہ پر نشان لگا کر اپنے پاس رکھیے۔ تقریر ختم کرنے کے بعد بیاض سے نظمیں پڑھ دیں[1]۔ یہ واقعہ شاید اسی مشاعرے میں پیش آیا تھا۔

ایک دفعہ اہلِ احمد آباد نے یومِ ولی منایا تھا[2]۔ جس میں مجھ سے ولی پر مقالہ پیش کرنے کے لیے کہا گیا تھا۔ احمد آباد ریڈیو اسٹیشن نے اس مشاعرے کو وہیں سے نشر کیا تھا۔ غرض اہلِ احمد آباد اُردو کے سلسلے میں ہمیشہ کچھ نہ کچھ کرتے رہے ہیں۔ موجودہ دور میں وارث علوی، رحمت امروہوی، محی الدین بامبے والے، احمد حسین قریشی اور کالجوں کے پروفیسر صاحبان اُردو کے سلسلے میں رواں دواں ہیں۔ علّامہ شاہ وجیہ الدین کے خاندان کے ایک فرد ولی اپنے زمانے کے مجتہد گزرے ہیں اور اس عہد میں اسی خاندان کے دوسرے فرد وارث علوی جدیدیت کے علم بردار کی حیثیت سے شہرت کے مالک ہیں۔

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے کیفی صاحب پر مضمون "کتاب نما" بابت۔

[2] شاید ۱۹۴۸ء کے بعد۔

حضرت رحمت اُردو کے لیے رحمت ہیں۔ تقریباً دس بارہ سال سے ان کے ادبی کاموں سے واقف ہوں۔ ان کا پہلا خط شاید دس سال قبل ملا تھا۔ اس میں موصوف نے اپنا تعارف کرایا اور اپنی ادبی خدمات سے مجھے آگاہ کیا تھا۔ اس کے بعد کئی سال تک خط و کتابت بند رہی جیسے کرنٹ قائم تھا مگر فیوز اُڑ گیا تھا۔ چند سال پر پھر خط و کتابت شروع ہوئی اور ایسی کہ اب تک برابر قائم ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ بہ نفس نفیس ملاقات بھی ہوئی۔ رحمت صاحب گجرات اُردو بورڈ کے سکریٹری ہیں۔ اس بورڈ نے ولی ایوارڈ قائم کیا ہے اور اوّلین ایوارڈ کے لیے مجھے مستحق سمجھا گیا۔ اس کا جشن جنوری ۱۹۸۵ء میں بہت اہتمام سے منایا گیا تھا۔ رحمت صاحب شاعر بھی ہیں۔ مشاعرے میں دور دور جا کر پڑھتے ہیں اور لوٹتے بھی ہیں۔

کتاب "یادوں کی پرچھائیاں" میں رحمت صاحب نے ماضی کی جو جھلکیاں پیش کی ہیں وہ دستاویزی حیثیت رکھتی ہیں۔ یادداشتوں کے علاوہ بعض یادگار تصویریں اور احمد آباد میں اُردو تحریکوں، جشنوں، جلسوں، ہنگاموں کا بھی ذکر کیا گیا ہے جن کی وجہ سے کتاب حوالہ جاتی کتاب بن گئی ہے۔ مجھے توی امید ہے کہ ادبی حلقوں میں کتاب کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ یہی مصنّف کی محنت کا انعام ہے۔

سید ظہیر الدین مدنی

انجمن ترقی پسند مصنفین کی اردو کانفرس ۱۹۵۲ء
دائیں سے بائیں
شہاب الدین دسنوی - احتشام حسین - ابو ظفر ندوی - صفدر حسین بخاری - مصطفٰے میاں قادری - نجیب اشرف ندوی
اوما شنکر جوشی - اعجاز صدیقی

کامل عاشقی

حزیں قریشی

گجرات کے پہلے گورنر مہدی نواز جنگ راہی معصوم رضا کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوئے درمیان کلیم احمد آبادی کھڑے ہیں۔
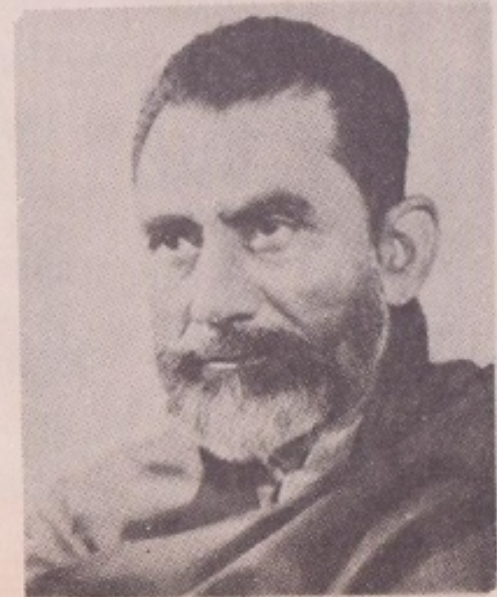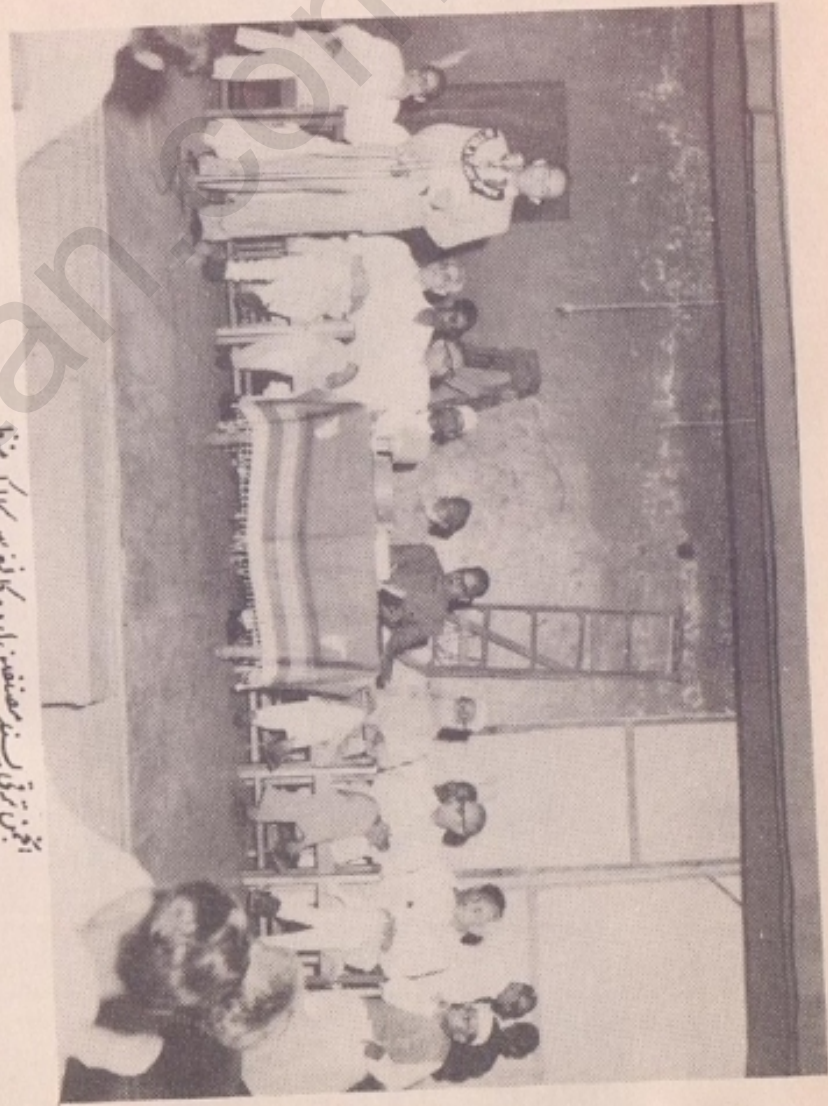
انجمن ترقی پسند مصنفین اردو کانفرس کا ایک منظر
دائیں سے بائیں
ڈاکٹر چھوٹو بھائی نائک۔ شہاب الدین دسنوی۔ احتشام حسین۔ ابوظفر ندوی۔ نادر ولیم۔ صفدر حسین بخاری۔ مصطفٰے میاں قادری
نجیب اشرف ندوی۔ اعجاز صدیقی۔ مائک پر وارث علوی
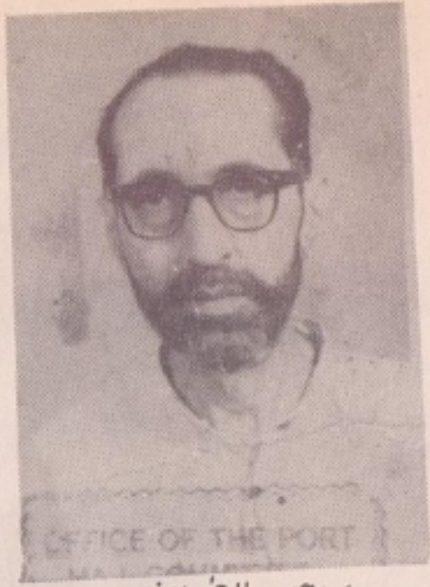
سید حبیب الرحمٰن غزنوی

جوش ملیح آبادی

مجاز جوش نیاز حیدر

سجاد ظہیر اور جوش ملیح آبادی

کیفی اعظمی جوش ملیح آبادی
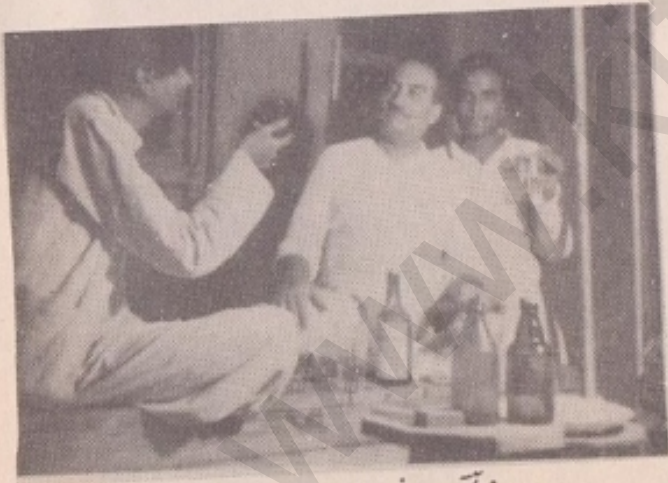
راز صدیقی شاہ جہانپوری

کلیم احمد آبادی

حکیم بشیر احمد خاں زخمی دہلوی مرحوم

جمیل کلیمی
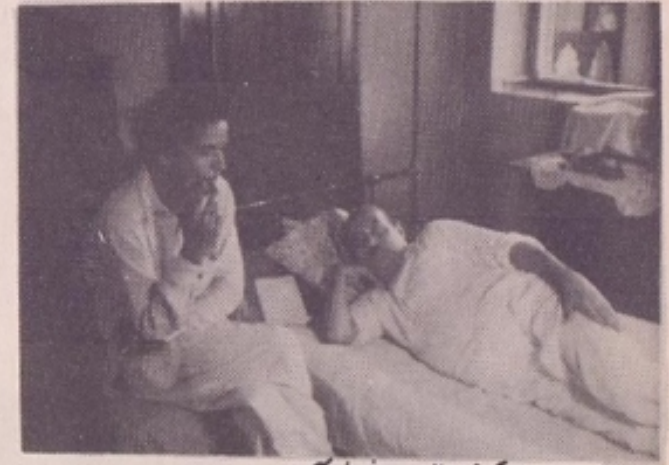
کرشن چندر

محمود مائل

نسیم احمد کامل صدیقی

• حبیب الرحمٰن غزنوی سخی محمد شریف سلیمان ڈیبائی مصطفیٰ میاں قادری۔ کلیم احمد آبادی۔ نجیب اشرف ندوی
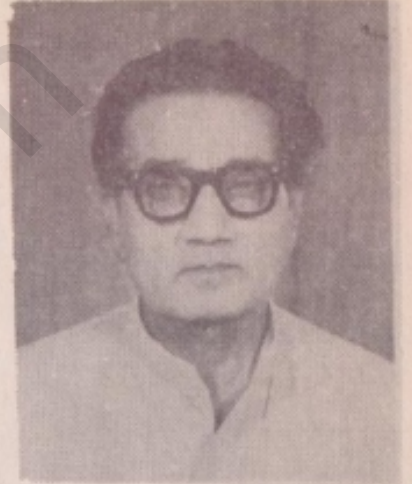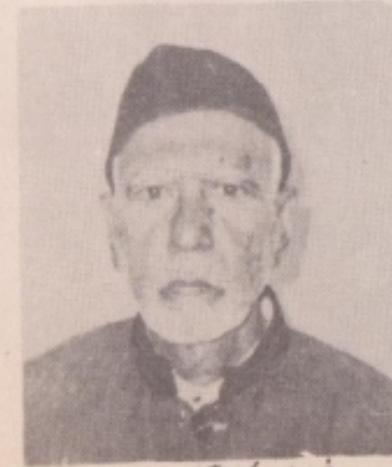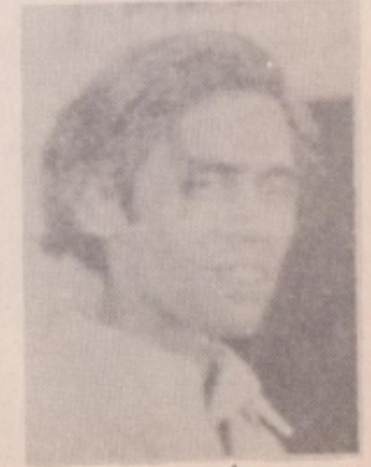
احمد آباد کے دو استاد شاعر
کلیم احمد آبادی اور فخر گجرات محوِ گفتگو داہنی طرف حبیب الرحمٰن غزنوی

ظہیرالدین مدنی ۔ شکیل بدایونی مصطفیٰ میاں قادری برادر خورد محمد ابراہیم آزاد جگن ناتھ آزاد

دائیں سے بائیں
جمیل کلیمی ۔ عیش ٹونکی ۔ جوش ملیح آبادی

کلیم جوبلی کا ایک یادگار فوٹو

شکیل بدایونی - حبیب الرحمٰن غزنوی - جگن ناتھ آزاد - جینتی دلال
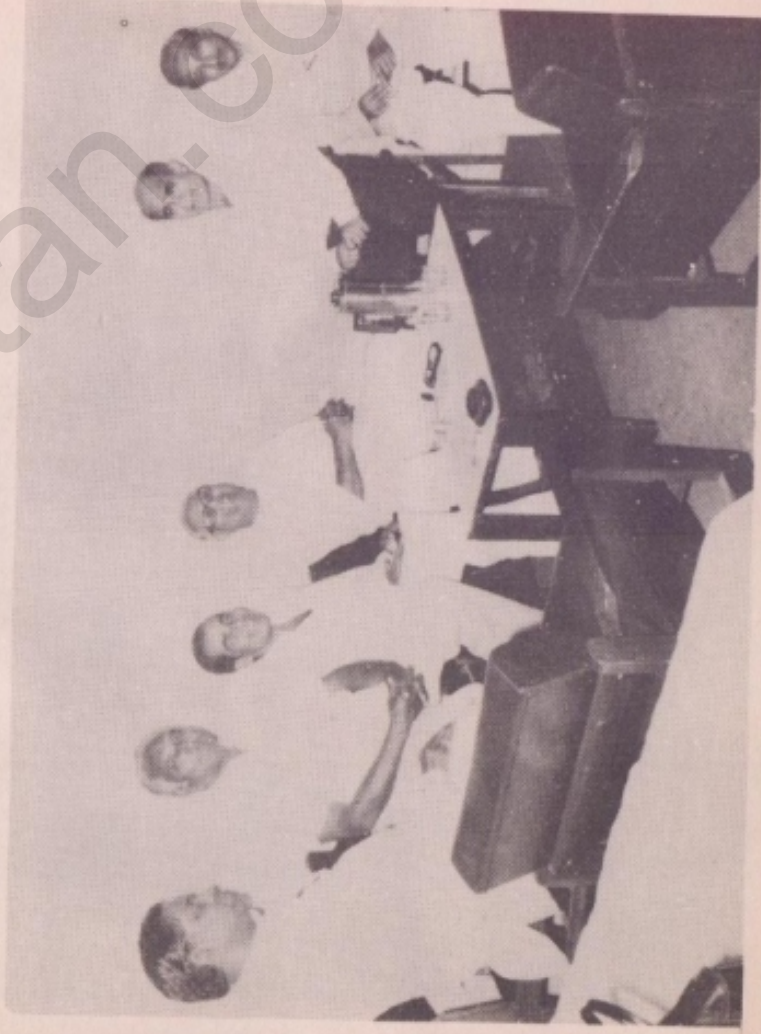
احمد آباد کے اردو فارسی کے پروفیسر کالی داس گپتا رضا کے ساتھ محی الدین بمبئی والا - وارث علوی

اردو کانفرس کا صدر دروازہ

یادش بخیر

رحمت امروہوی کے حوالے سے نہ جانے تقسیم سے قبل کتنی یادیں ذہن میں تازہ ہوگئیں. یہ دیکھ کر یہ سوچ کر اور یہ جان کر حیرت زدہ رہ جاتا ہوں کہ ہمارے آبائی وطن (مرحوم) کے احباب دنیا کے کس کس گوشے میں پھیلے ہوئے ہیں اور وہ کیسے کیسے یادگار کارنامے انجام دے رہے ہیں. انھی قابلِ قدر احباب میں جناب رحمت امروہوی بطور خاص قابلِ ذکر ہیں ؎

شکل ظاہر کچھ بھی ہو جائے وہی رہتے ہیں ہم
ہم کہیں بھی ہوں مگر امروہوی رہتے ہیں ہم

رحمت کا مجموعہ کلام "اضافہ" شائع ہوکر قبولیتِ عامہ کا شرف حاصل کرچکا ہے۔ ان کے اس مجموعۂ کلام کو اترپردیش اُردو اکاڈمی، بنگال اُردو اکاڈمی اور گجرات اکاڈمی نے بطور خاص انعام سے نوازا ہے۔ اور یہ امر مسرت بخش ہے کہ اس قابلِ قدر مجموعے کا اب ہندی ایڈیشن شائع کیا جارہا ہے. نظم کے ساتھ ساتھ نثر پر بھی انھیں دسترس حاصل ہے۔ اس سلسلے میں ان کی تصنیف "یادوں کی پرچھائیاں" ترتیب کے مرحلے سے گزر کر اشاعت کی منزل میں داخل ہوچکی ہے. اس کتاب میں مصنف نے احمد آباد کی ادبی و شعری زندگی کے بارے میں اپنی یادوں اور یادداشتوں کو یکجا کردیا ہے۔ احمد آباد برّ کوچک پاک و ہند میں اپنی بعض خصوصیات کے لحاظ سے نمایاں اہمیت رکھتا ہے۔ یہ شہر متعدد تاریخی اجتماعات کا مرکز رہ چکا ہے. صنعتی اعتبار سے اس کی اہمیت مسلّم ہے لیکن ادب و شعر کے نقطۂ نظر سے بھی احمد آباد کی مرکزیت کچھ کم نہیں۔

رحمت امروہوی کی عمرِ عزیز کا بہت بڑا حصہ اس شہر میں گزرا ہے۔ انھوں نے احمد آباد کی حد تک اپنی ادبی سرگذشت کو اس کتاب کی شکل میں ترتیب دے دیا ہے. کتاب
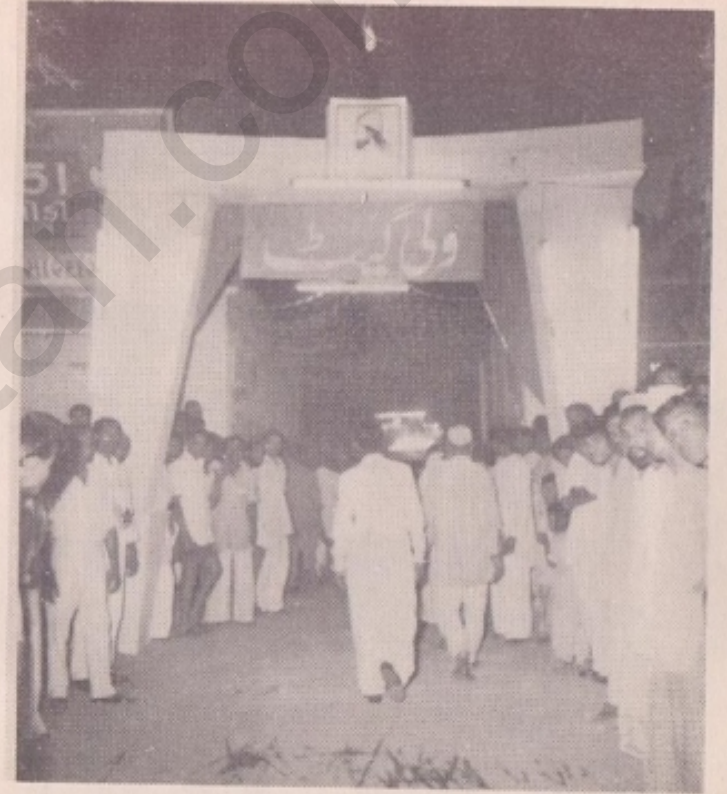
کے موضوعات بہت دلچسپ ہیں :

احمد آباد کی گذشتہ پچیس سالہ علمی، ادبی و تہذیبی سرگرمیاں۔

احمد آباد کے یادگار مشاعرے۔

قابلِ ذکر کانفرنسیں۔

احمد آباد میں جوشؔ و جگرؔ مراد آبادی

اُن مرحوم شعرا کا ذکر جو اپنے زمانے میں غیر معمولی قدر و منزلت رکھتے تھے مگر اپنا مجموعۂ کلام شائع نہ ہونے کے سبب اب پردۂ گمنامی میں جا چھپے اور آیندہ دس سال میں کوئی ان کے نام سے بھی واقف نہ ہوگا کام تو بڑی چیز ہے .....

بعض شعرا کا کلام ضائع ہو چکا تھا۔ رحمت امروہوی قابلِ مبارکباد ہیں کہ انھوں نے بڑی جانکاہی اور تحقیق و تلاش کے بعد ان کا جتنا کچھ کلام دستیاب ہوا کتاب میں شامل کر دیا۔ اس سلسلے میں نصرت کو اپنے حافظے سے بڑی مدد ملی۔ جزاک اللہ۔

کتاب میں بعض نایاب تصاویر اور مشاہیر کے خطوط بھی شامل ہیں جن سے کتاب کی قدر و قیمت میں اور اضافہ ہوگیا ہے۔ الغرض "یادوں کی پرچھائیاں" ایک ایسی دستاویز ہے جس میں اس ممتاز شہر کی ادبی زندگی ۱۹۴۷ء سے ۱۹۸۸ء تک ایک یادگار مرقع کی صورت میں جلوہ گر ہوگی۔

بے شک رحمت امروہوی پر احمد آباد کا حق بھی ہے۔ وہ پندرہ سال کی عمر سے اس تاریخی شہر میں مقیم ہیں۔ ان کی پرجوش و پرشوق نوجوانی اس خوبصورت بستی کے گلی کوچوں میں گزری ہے۔ رحمت احمد آباد کی ادبی و فکری زندگی کا ایک ناقابلِ فراموش حصہ بنے ہیں اور اب تک ہیں عجیب بات ہے کہ ہم دونوں کی جنم بھومی ایک ہے۔ (یادش بخیر امروہہ) لیکن ہم اب تک ایک دوسرے سے نہیں ملے لیکن ظاہری جدائی کے باوجود تعلق خاطر کے باہمی رشتے استوار ہیں اور انشاء اللہ استوار رہیں گے۔

رئیس امروہوی

۵ نومبر ۱۹۸۶ء کراچی

"اضافہ" کے تعلق سے "یادوں کی پرچھائیاں"

گزشتہ چالیس سال میں احمد آباد میں جن ادیبوں کے دم سے اُردو زبان و ادب کے چراغ کی لو اونچی رہی اور جن کی تگ و دو سے اُردو شعر و ادب کو فروغ ملا ان میں رحمت امروہوی کا نام نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ جس طرح مولانا حسرت موہانی کو چکّی کی مشقت کے ساتھ اپنی مشقِ سخن کو جاری رکھنے پر فخر تھا اسی طرح بھائی رحمت امروہوی کپڑا مل میں ایک ماہرِ فن بنکر کی حیثیت سے اپنی محنت کے ساتھ ساتھ ادبی مشاغل جاری رکھنے کے لیے داد کے مستحق ہیں۔ اُن کی اس لگن اور حوصلہ مندی میں شاید انجمن ترقی پسند مصنّفین کا بھی حصّہ ہے جس سے وہ اُس زمانے سے وابستہ ہیں جب وارث علوی اس کے سکریٹری ہوتے تھے۔ اُس زمانے میں وارث علوی اپنی تقریروں اور تحریروں میں جس دیوانگی اور جوش سے ترقی پسندوں کے موقف کی حمایت کرتے تھے اسی کفِ دردہانی سے وہ اب اس کی مذمت کرتے ہیں لیکن اس تحریک سے رحمت امروہوی کی وفاداری بشرطِ استواری رہی ہے اس کے واضح نقوش ان کی عملی زندگی اور شاعری دونوں میں نظر آتے ہیں۔

محنت کش طبقے کی جدوجہد سے ان کا رشتہ ہر دور میں مضبوط رہا ہے اور اس رابطے نے باوجود مشکلات کے انسان کے بہتر مستقبل پر ان کے یقین و ایمان کو متزلزل نہیں ہونے دیا لیکن مجھے اکثر محسوس ہوا ہے کہ تحریک کے مقابلے میں ان کی شخصیت کو سنوارنے میں اُردو کلچر کی تہذیبی اور انسانی قدروں کا زیادہ حصّہ رہا ہے۔ ان کی شائستگی، نرمی، رواداری، شیریں کلامی، وطن دوستی اور دردمندی ایسی صفات ہیں جو ہماری زبان و ادب کے خمیر کی حیثیت رکھتی ہیں۔ چند سال قبل جب مجھے رحمت امروہوی صاحب کے

مجموعۂ کلام "اضافہ" کے مطالعہ کا موقع ملا تو احساس ہوا کہ کلاسیکی یا نو کلاسیکی غزل سے ان کے تعلقِ خاطر کا سبب یہی ہے کہ اُن کا مزاج اُس سے ہم آہنگ ہے۔ انھوں نے نظمیں بھی کہی ہیں لیکن چند نظموں سے قطعِ نظر اُن کا تخلیقی جوہر غزل ہی میں نمایاں ہوا ہے۔ احمد آباد میں ان کی زندگی کئی پُر آشوب ادوار سے گزری ہے۔ ذاتی اور اجتماعی طور پر انھوں نے عدم تحفظ، بے چارگی، محرومی اور تنہائی کے بعض بڑے اذیت ناک اور پُر عذاب لمحے گزارے ہیں۔ اس کی سچی روداد اگر کہیں ملتی ہے تو ان کی غزلوں کے اشعار میں یہ چند شعر دیکھیے:

صبح نکلے ہیں جو اپنے گھر سے
کیا خبر شام کو گھر جائیں گے

ہم ایسے دور میں بھی جی رہے ہیں
اسے قدرت کا اک انعام لکھیے

قدم قدم پہ حوادث قدم قدم خطرے
بتا رہے ہیں کہ منزل کا فاصلہ کم ہے

جدا ہوئے تو پلٹ کر کبھی نہیں دیکھا
جو مل گئے ہیں تو پھر ٹوٹ کر ملے بھی بہت

تھک گیا دُعا کر کے دستِ بے دُعا دیکھوں
کوئی پھل گرے شاید شاخ کو ہلا دیکھوں

شعلوں کے درمیاں مرا گھر مدّتوں رہا
میں حادثوں سے سینہ سپر مدّتوں رہا

ایسے بے شمار تیکھے اور دلگداز اشعار ان کے مجموعہ میں مل جاتے ہیں۔ رحمت صاحب شعر گوئی کے ساتھ ساتھ بڑی سادہ اور شگفتہ نثر بھی لکھتے رہے ہیں۔ "یادوں کی پرچھائیاں" میں شامل ان کے چند مضامین میں نے دیکھے ہیں۔ گذشتہ چالیس سال کے عرصے میں احمد آباد میں جو ادبی اور تہذیبی ماحول رہا ہے اور جن باکمال شخصیتوں نے اس ماحول میں گرمی اور روشنی پیدا کی ہے۔ رحمت امروہوی صاحب نے کوشش کی ہے کہ ان کے حقیقت پسندانہ اور جاندار قلمی خاکے تیار کر کے مستقبل کے لیے انھیں محفوظ کر جائیں۔ ان میں ترقی پسند مصنّفین کی کانفرنسیں، مشاعرے، جلسے، مشاہیرِ فن سے ملاقاتیں، محفل آرائیاں، نایاب خطوط اور تصاویر یہ سب شامل ہیں...... اب جبکہ زندگی کی ایک نئی بساط بچھ رہی ہے جو بڑی بے رحم بے رنگ اور کھردری ہے تو ماضی کی بازیافت کا کام بہت اہم ہو جاتا ہے کہ اس بہانے اُس شاداب اور روشن وادی کی طرف بھی کچھ کھڑکیاں کھلی رہیں گی جہاں متاعِ دل بھی کچھ قدر رکھتی تھی۔

چونکہ ماضی قریب کی اس زندگی سے رحمت صاحب خود جذباتی طور پر وابستہ رہے ہیں اس لیے اس کی عکاسی اور فضا آفرینی میں ایک تخلیقی انداز پیدا ہو گیا ہے اور قاری کو ایسا لگتا ہے جیسے وہ خود اس ماحول میں پہنچ گیا ہے۔ یہ محاکاتی رنگ کئی مضامین میں بہت موثر اور جاندار ہے۔ اس یادوں کے آئینے میں رحمت صاحب کی شخصیت کے نقوش بھی کہیں تابناک، کہیں تیکھے اور کہیں دھندلے اُبھرتے دکھائی دیتے ہیں۔

مجھے امید ہے کہ "یادوں کی پرچھائیاں" اہلِ نظر کی قدر افزائی سے محروم نہیں رہے گی۔

قمر رئیس
۲۰ر دسمبر ۱۹۸۵ء دہلی

عرضِ حال

بہت دنوں سے یہ خواہش تھی کہ احمد آباد کی چالیس سالہ علمی ادبی و تہذیبی سرگرمیاں قلم بند کروں۔ ایک تو یہ کہ میں نثر کا آدمی نہیں ہوں شعر کہنے کی بات الگ ہے۔ دوسرے یہ کہ دل لگا کر اتنا سارا لکھنا، اس لیے ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ ایک روز کچھ موڈ بنا تو کاغذ قلم لے کر کچھ یادداشتوں کو ذہن سے کاغذ پر منتقل کرنے لگا۔ چند ہی روز میں "یادوں کے آئینے" کے عنوان سے ایک طویل مضمون تیار ہو گیا۔ چونکہ یہ مضمون احمد آباد سے متعلق تھا۔ اس لیے یہیں کے ماہنامہ گلبن میں اشاعت کے لیے بھیج دیا۔ مضمون دو قسطوں میں چھپا کافی پسند کیا گیا۔ بہت سے خطوط "گلبن" میں شائع ہوئے، کچھ خطوط مجھے بھی ملے۔ جن میں مضمون کی پسندیدگی کے ساتھ اس بات کا بھی اظہار کیا گیا تھا کہ کاش یہ سلسلہ دراز ہوتا۔ اس مضمون کی اشاعت کے بعد "گلبن" کے اڈیٹر ظفر ہاشمی میرے پاس آئے اور اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ میں گجرات کے مرحوم استاد شعرا پر سوانحی خاکے لکھوں جسے وہ ہر ماہ ماہنامہ "گلبن" میں شائع کرتے رہیں گے۔ کام مشکل لگا اور ڈر بھی لگا کہ شروع کرنے کے بعد اگر یہ سلسلہ ٹوٹ گیا تو رسوائی ہو گی۔ ہر ماہ ایک خاکہ لکھنا اور مرحوم شعرا کے گھر جا کر ان کے عزیز و اقارب سے غزلیں اور اشعار اکٹھے کرنا اور پھر یہ سب ملتا بھی ہے کہ نہیں۔ مرنے والے کے بعد اگر اس گھر میں کوئی اور ادبی ذوق رکھتا ہے تو وہ ایسی چیزیں

سنبھال کر رکھتا ہے، ورنہ سب ضائع ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ میں نے ظفر ہاشمی صاحب سے کہا کہ جناب میں یہ کام نہیں کر پاؤں گا۔ آپ کسی اور سے لکھوائیے لیکن ہاشمی صاحب اپنی بات پر اڑے رہے۔ یہ کام آپ ہی کو کرنا ہے اور آپ کریں گے۔ کافی بحث کے بعد طے ہوا کہ گجرات کے مرحوم شعرا پر تو نہیں البتہ احمد آباد کے مرحوم استاد شعرا پر میں خاکے لکھنے کی کوشش کروں گا۔ لیکن اس پر بھی یہ شرط رہی کہ میں صرف انھیں مرحوم شعرا پر خاکے قلمبند کروں گا، جنھیں میں نے دیکھا ہے۔ مشاعروں میں پڑھتے سُنا ہے، جن سے میں ملا ہوں ...... کچھ مہلت دیجیے تاکہ میں خود کو اس کام کے لیے آمادہ کر لوں، دو تین شعرا پر خاکے لکھ لوں۔ اس کے بعد میں آپ کو مطلع کروں گا۔ آپ اپنے رسالے میں اعلان کر دیں۔ چنانچہ دو ماہ کے عرصے میں میں نے کام شروع کر دیا۔ اور دو تین خاکے تیار کر کے روانہ کر دیے۔ اب کچھ ہمت بندھی اور ایسا لگا کہ یہ کام پورا ہو جائے گا۔ "گلبن" میں ہر ماہ خاکے چھپتے رہے، میری پریشانیوں میں اضافہ ہوتا رہا۔ کسی طرف سے کسی طرح کا کوئی تعاون نہیں ملا۔ مرحوم شعرا کے لواحقین نے شاید اس کام کی کچھ اہمیت نہیں سمجھی یا اس میں میرا ذاتی مفاد پوشیدہ سمجھا اور برابر ٹالتے رہے۔ نہ کسی شاعر کی تصویر ملی نہ کسی نے کلام ہی فراہم کر کے دیا۔ چاروناچار اپنے حافظے پر بھروسا کیا۔ جو کچھ میرے ذہن میں تھا اس کو محفوظ کر دیا۔ تصویریں کچھ میرے پاس تھیں۔ لیکن سب نہیں تھیں، اس لیے تصویر شائع کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔

سوانحی خاکوں کا سلسلہ مسلسل دو سال تک چلا جسے میں اب کتابی صورت میں پیش کر رہا ہوں۔ اس میں زبان و بیان کی غلطیاں ہوں گی، کہیں کہیں جملے بے ربط بھی ہو گئے ہوں گے۔ اس کا میں اعتراف کرتا ہوں۔ بہر حال میرا ایک مقصد تھا اور وہ یہ کہ احمد آباد کے ایسے استاد شعرا جو اپنے زمانے میں مستند استاد مانے جاتے تھے، عزت و وقار سے دیکھے جاتے تھے۔ جن کا آج تک مجموعہ کلام بھی شائع نہیں ہوا۔ اور آئندہ دس پندرہ سالوں کے بعد کوئی ایسا شخص بھی نہیں ملے گا جو بتا سکے کہ اس نام کے بھی احمد آباد میں شعرا تھے۔ ان کے کچھ حالات

اور کلام محفوظ ہو جائے بس اسی خواہش کے پیش نظر یہ کتاب حاضر خدمت ہے۔

میں اپنے ان تمام احباب کا شکر گزار ہوں جنھوں نے اس کتاب کے سلسلے میں نایاب تصاویر مشاہیر کے خطوط اور بعض ضروری معلومات فراہم کیں خاص طور سے جاوید انصاری، احسان جعفری، جمال قریشی، تبسم مبارکپوری، شاہد کلیم، ظفر ہاشمی، سجاد قریشی، غلام رازق وغیرہ، میری بچی فہمیدہ بیگم جس نے اس مسودہ کی دو خوبصورت نقلیں تیار کیں۔ اللہ پاک اس کو خوش وخرم رکھے۔

جناب رئیس امروہوی، ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی اور پروفیسر اقم رئیس کا بھی مشکور ہوں کہ صرف ایک مرتبہ یاد دہانی کرانے پر ان حضرات نے کتاب سے متعلق اپنی رائیں تحریر کر کے مجھے بھیج دیں۔

رحمت امروہوی
احمد آباد

یادوں کے آئینے

"گذشتہ پچیس سال کی احمد آباد کی علمی، ادبی، اور تہذیبی سرگرمیوں کی چند جھلکیاں"

غالباً ۱۹۶۰ء کی بات ہے اس وقت احمد آباد کی علمی، ادبی فضا کافی ہنگامہ خیز تھی اور کلیم بکڈپو خاص مرکز تھا۔ شام ہی سے کلیم بکڈپو پر شاعروں اور ادیبوں کا جمگھٹا شروع ہو جاتا تھا۔ کچھ لوگ رات کو آٹھ یا نو بجے آتے تھے۔ حکیم بشیر احمد خاں زخمی، وارث علوی، محمد علوی، محمد نصیر نظیری، رسول میاں شیخ، عادل منصوری، اور راقم الحروف، زخمی صاحب عام طور سے ۹ بجے آیا کرتے تھے۔ کچھ غیر شاعر بھی تھے، جن کی حاضری بلاناغہ ہوا کرتی تھی۔ جس میں مولانا فخر الدین ندوی، علی میاں، چینئن کمار چیتن، سید حبیب الرحمٰن غزنوی بھی اس محفل میں گاہے گاہے شرکت کرتے تھے۔ لیکن ان کا اپنا ایک معمول تھا۔ وہ رات کو زیادہ دیر تک نہیں ٹھہرتے تھے۔ دس یا ساڑھے دس بجے تک جایا کرتے تھے۔ اور یہ محفل رات کو ۹ بجے کے بعد شروع ہوا کرتی تھی۔ جب جمیل صاحب اپنی دکان بند کر دیا کرتے تھے، ہم سب لوگ دکان کے باہر نکلے ہوئے تختے پر اپنی ادبی دکان سجا لیا کرتے تھے گفتگو خالص ادبی ہوا کرتی تھی۔ کبھی فقرہ بازی بھی ہو جایا کرتی تھی۔ لیکن اس میں بھی ادب کو ملحوظ رکھا جاتا تھا۔ آج جب یہ سطریں لکھنے بیٹھا ہوں تو دل کی عجیب

کیفیت ہے۔ کیا شب و روز تھے کیسے لوگ تھے۔

وہ صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں!
اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

حبیب الرحمٰن غزنوی اللہ کو پیارے ہوگئے، زخمی صاحب، جمیل صاحب، نصیر صاحب آج یہ لوگ اس دنیا میں نہیں ہیں اور جو کچھ بچے ہیں انھیں فکر معاش اور زندگی کی ذمہ داریوں نے اس قدر مصروف بنا دیا ہے کہ ایک دوسرے کی صورت مدتوں نظر نہیں آتی۔ پھر بھی یہ سوچ کر سکون محسوس ہوتا ہے کہ آج کی اس تیز رفتار زندگی میں باقی ماندہ لوگوں نے اپنا ادبی مشن جاری رکھا ہے۔ عادل منصوری نے اپنی ادبی زندگی کو جمود کی نذر نہیں کیا —— وہ آج بھی ادب تخلیق کر رہے ہیں۔ وہ پہلے سے کہیں زیادہ آگے ہیں۔ محمد علوی نے ہندستان پاکستان کے ادب میں اپنا ایک مخصوص مقام بنا لیا ہے۔ "خالی مکان" "آخری دن کی تلاش" اور تیسری کتاب کے بعد سُنا ہے "چوتھے آسمان" کی تیاری میں لگے ہوئے ہیں۔ محمد علوی نے اپنا سفر بڑی تیزی سے طے کیا ہے اور شروع ہی سے زود گو رہے ہیں اپنے حلقے کے سب سے کم کہنے والوں میں میرا شمار ہوتا ہے اور اس وقت بھی یہی حال تھا۔ جب تمام احباب روزانہ یا دوسرے روز نئی غزل یا نئی نظم کہہ کر سنایا کرتے تھے۔ مظہر الحق علوی بھی روزانہ جمیل صاحب کی دکان پر آتے تھے۔ لیکن ہم لوگوں کے ساتھ زیادہ دیر نہیں ٹھہرتے تھے۔ ——
مظہر الحق علوی جتنے کم گو ہیں، اتنے ہی زود نویس اور یہی وجہ ہے کہ وہ آج ۶۶ ناولوں کا ترجمہ کر چکے ہیں اور ان پر انھیں اتر پردیش گورنمنٹ سے ایوارڈ بھی مل چکا ہے۔

وارث علوی کا چونکہ پیشہ ہی پڑھنا پڑھانا ہے اور اس پیشے کے لوگ بولتے اور لکھتے زیادہ ہیں۔ بولنے کا تو یہ عالم ہے کہ آپ ادب کا کوئی بھی موضوع انھیں دے دیجیے اور کہیے کہ وارث صاحب آپ کو دو گھنٹے بولنا ہے۔ یقین جانیے ڈھائی گھنٹے تو ہو سکتے ہیں مگر پونے دو گھنٹے ہرگز نہیں ہو سکتے۔ لکھنے کا تو یہ عالم ہے کہ ہمیشہ چونکا دینے والی بات کہتے ہیں۔ اور کچھ اس انداز سے کہتے

ہیں کہ ہندستان اور پاکستان کے نقادوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتے ہیں "ایلیٹ" اور انگریزی کے دوسرے ادیبوں کے حوالے ان کی تحریروں میں جا بجا ملتے ہیں دراصل وارث صاحب پڑھتے بہت زیادہ ہیں، پڑھتے تو خیر سبھی ہیں لیکن وارث صاحب میں پڑھ کر ہضم کرنے کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہے۔ اور اس کا انکشاف ان کی تحریروں سے ہوتا ہے۔ تنقید میں نیا پہلو تلاش کرنا، اختلافی مسائل لانا ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ وارث صاحب کسی زمانے میں کٹر ترقی پسند تھے۔ اگر میرا حافظہ غلطی نہ کرتا ہو تو انجمن ترقی پسند مصنفین کے سکریٹری بھی رہ چکے ہیں۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کی مشہور زمانہ بھیمڑی اردو کانفرنس میں وارث صاحب نے دھواں دھار تقریر کی تھی۔ وہ تقریر اور کتابچہ آج بھی میرے پاس محفوظ ہے۔ بھیمڑی کانفرنس میں سردار جعفری، کیفی اعظمی، سجاد ظہیر، جاں نثار اختر، مجاز لکھنوی اور دوسرے بہت سے شعرا حضرات شریک تھے۔ یہ زمانہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے انتہائی عروج کا زمانہ تھا۔ اور ہندستان کے شاعروں اور ادیبوں کا ایک بہت بڑا قافلہ اس میں شریک تھا۔ میٹنگیں بھی باقاعدہ ہفتہ وار ہوا کرتی تھیں۔ اب وارث صاحب کے نظریات بالکل بدل چکے ہیں اور جب سے امریکہ کا دورہ کر کے آئے ہیں اس میں کچھ سختی آگئی ہے۔ ویسے یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ وارث آج جو کچھ ہیں۔ یہ سب انجمن ترقی پسند مصنفین کی دین ہے۔ بلکہ قلم چلانے کی تحریک اور قلم کو سلیقہ انجمن ہی سے ملا ہے۔ اس بات کا اعتراف وارث صاحب بھلے ہی نہ کریں۔ لیکن ان کا دل اس بات کی گواہی ضرور دے گا۔ شب کو دس بجے تک جمیل صاحب کی دکان سے ملحق تختے پر نشست رہتی تھی۔ دس بجے کے بعد وارث صاحب اور مظہر صاحب چلے جاتے تھے، محمد علوی، عادل منصوری، زخمی صاحب، نصیر صاحب، جمیل صاحب فخر الدین ندوی، چینتن کمار، اور راقم الحروف۔ یہ سب قافلہ اڈوانس سینما کے سامنے آغا کے ہوٹل کی طرف رخ کرتا۔ آغا کا ہوٹل ایک ایرانی کا ہوٹل تھا اور غالباً مالک کا نام آغا ہی ہو۔ اس لیے ہم سب لوگ اسے آغا کا ہوٹل کہا کرتے تھے۔ اس ہوٹل کا انتخاب ہم نے اس لیے کیا تھا کہ اس ہوٹل میں بھیڑ بھاڑ

بہت کم رہا کرتی تھی۔ عام ہوٹلوں کی طرح شور وغل نہیں ہوا کرتا تھا۔ جگہ بھی پرسکون تھی۔ اس لیے محفل یاراں آغا کے ہوٹل میں جمتی تھی۔ اگر کسی وجہ سے اس قافلے کے کسی شخص کو آنے میں تاخیر ہوتی تھی تو وہ دس بجے کے بعد آغا کے ہوٹل کا رُخ کرتا تھا۔ دس بجے سے گیارہ بجے تک بیٹھنا ہم لوگوں کا معمول تھا جہاں تک مجھے یاد ہے گفتگو کا موضوع ہمیشہ ادبی ہوتا تھا۔ دیگر کسی مسئلے پر کبھی بات نہ ہوتی تھی۔ گیارہ بجے کے بعد ہم سب لوگ لال دروازہ کے گارڈن کا رُخ کرتے تھے اور وہاں سے کبھی ایک بجے اور کبھی ڈیڑھ بجے گھر کا رُخ کرتے تھے۔ یہ اس قافلے کا روزانہ کا معمول تھا۔

آغا ہوٹل کی کبھی ادبی بحث ہنگامہ کا رُخ بھی اختیار کر لیتی تھی اور ایک دوسرے کا لہجہ درشت بھی ہو جایا کرتا تھا۔ حکیم بشیر احمد خاں کو فن اور زبان پر زبردست گرفت حاصل تھی۔ غلط بات کبھی برداشت نہیں کرتے تھے شعر میں ذرا سا بھی سقم آیا ماتھے پر بل پڑ جایا کرتے تھے۔ سرِ محفل ٹوکنا ان کی عادت میں شمار تھا۔ ان کی اس عادت سے ہم لوگ بیزار ضرور تھے۔ مگر اس سے فائدہ بہت پہنچا۔ خود زخمی صاحب کا یہ عالم تھا کہ شعر کا حلیہ بگڑتا ہے تو بھلے ہی بگڑ جائے۔ مگر عروضی اور فنی خامی نہ رہے۔ اس سلسلے میں کبھی کبھی بحث بڑھ جاتی تھی اور اتنی شدت اختیار کر لیتی تھی، ایسا اندازہ ہوتا تھا کہ اب یہ محفل یاراں درہم برہم ہو گئی۔ کل سے کوئی نہیں آئے گا۔ مگر ایسا نہیں ہوتا تھا۔ دوسرے دن پھر اسی طرح محفل منعقد ہوتی تھی۔ گویا کل کچھ ہوا ہی نہیں تھا فراخ دلی اور وضعداری کے کیسے کیسے نمونے تھے۔ اس سلسلے کا لگے ہاتھوں ایک واقعہ بھی سُن لیجے۔ ممکن ہے لکھتے وقت بعد میں ذہن میں نہ رہے ایک مرتبہ نصیر صاحب اور زخمی صاحب کے درمیان کسی بات پر کافی گرما گرمی ہوگئی اور بات یہاں تک پہنچی کہ دونوں حضرات میں گفتگو بھی بند ہو گئی۔ زخمی صاحب بھی جمیل صاحب کی دُکان پر آتے رہے اور نصیر صاحب بھی، مگر دونوں میں بات چیت کا سلسلہ بند۔ زخمی صاحب کے متعلق میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ وہ کافی فراخ دل، صاف گو اور وضعدار آدمی تھے۔ لیکن تھے پٹھان،

پٹھان اکثر ضدی ہوتے ہیں۔ ان کا اثر زخمی صاحب میں بھی موجود تھا۔ اسی لیے سوچتے تھے کہ گفتگو میں پہل کیوں کروں۔ انھیں دنوں نصیر صاحب کی لڑکی کی شادی آگئی۔ شادی کے رقعے تقسیم ہوئے نصیری صاحب نے تمام احباب کو شادی کی دعوت دی۔ شادی کارڈ دیے، جن میں زخمی صاحب بھی شامل تھے۔ اتفاق سے شادی سے ایک روز قبل میری ملاقات گجراتی دواخانہ پر زخمی صاحب سے ہو گئی۔ باتوں باتوں میں میں نے زخمی صاحب سے کہا کہ کل نصیر صاحب کی لڑکی کی شادی ہے آپ کو بھی دعوت دی ہے؟" ہاں ہے" "آپ تو نہیں جائیں گے۔" "کیوں نہیں جاؤں گا۔" میں نے کہا "آپ کے درمیان تو شدید قسم کی لڑائی ہے اور بات چیت بند ہے فوراً ہی گرج کر جواب دیا ضرور جاؤں گا زحمت اس کی لڑکی کی شادی ہے۔ ہاں اگر لڑکے کی شادی ہوتی تو نہیں جاتا میری حیرت کی انتہا نہ رہی اور سوچتا رہا کہ با اصول آدمی کا ایک اصول یہ بھی ہوتا ہے۔ زخمی صاحب نے نصیر صاحب کی لڑکی کی شادی میں شرکت کی۔ نصیر صاحب دور سے دیکھتے ہی دوڑ پڑے اور دونوں دوست آپس میں گلے مل گئے۔ جب گلے مل گئے تو سارا گلہ ہی جاتا رہا۔ جہاں تک اصول کا تعلق ہے۔ زخمی صاحب کٹر کانگریسی تھے۔ کارپوریشن کے ممبر بھی رہے۔ مگر اصول اور صاف گوئی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ سوچتا ہوں کہ زخمی صاحب اتنے صاف گو، اتنے اصول پرست اور اتنے کٹر کانگریسی نہ ہوتے صرف آج کے زمانے کے کانگریسی ہوتے تو وہ کانگریس میں کسی اہم مقام پر ہوتے۔ زخمی صاحب صاف گو کانگریسی ہونے کے ناتے جیل میں بھی رہے۔ اور عمر بھر کھادی کے کپڑے اور کھادی کی ٹوپی پہنی۔ جو کانگریس نے انھیں وراثت میں دی تھی اور حق گوئی کی بنا پر ایک مرتبہ ایک شخص نے زخمی صاحب پر چاقو سے حملہ بھی کر دیا۔ اور حملہ کرنے والے کو زخمی صاحب نے اچھی طرح پہچانتے ہوئے اپنے بیان میں کہا کہ "میں اس شخص کو نہیں جانتا۔" زخمی صاحب میں درگذر کرنے کا جذبہ بھی موجود تھا۔

تقریباً رات کے دس بجے تھے۔ تمام احباب آغا کے ہوٹل میں مصروف

گفتگو تھے اور ایک دوسرے کے اشعار سے لُطف اندوز ہو رہے تھے۔ ایک بات لگے ہاتھوں اور بتاتا چلوں، برسات ہو گرمی ہو یا شدید قسم کی سردی، کوئی موسم ہماری اس محفلِ یاراں پر اثر انداز نہیں ہوتا تھا۔ باقاعدگی کے ساتھ محفل جمتی تھی۔ اب تو ایسی محفلیں خواب و خیال ہو گئی ہیں۔ اگر کوئی ساتھی ایک یا دو روز نہیں آیا تو سب کو تشویش ہو جاتی تھی کہ فلاں صاحب کیوں نہیں آئے۔ محفل جمی ہوئی تھی۔ زخمی صاحب کے دوست علی میاں تشریف لے آئے۔ علی میاں کی نشست صرف جمیل صاحب کی دُکان تک ہی محدود تھی۔ آغا کے ہوٹل میں وہ کبھی کبھار تشریف لاتے تھے۔ زخمی صاحب کے ہم عمر بھی تھے۔ اور پُرانی شناسائی تھی مذاق بھی کافی ہوتا تھا اور بات بھی تو تڑاق سے شروع ہوتی تھی اور ہمیں اس بات میں بہت لطف آتا تھا کہ اس تو تڑاق میں خلوص بہت شامل تھا۔ آغا کے ہوٹل میں آتے ہی ہم سب لوگوں سے مخاطب ہو کر کہنے لگے کہ میرے مکان پر ایک شعری نشست ہے۔ آپ تمام حضرات کو آنا پڑے گا۔ اور ہم سب لوگوں نے منظور کر لیا اور سوچا آغا کا ہوٹل نہ سہی، علی میاں کا گھر ہی سہی۔ کیا فرق پڑتا ہے۔ دراصل ہم لوگوں کی نشست اور آغا کے ہوٹل کا شہر میں خوب چرچا ہو گیا تھا۔ احمد آباد کی ادبی فضا کا نچوڑ رات کو دس بجے کے بعد آغا کے ہوٹل میں اکٹھا ہوتا تھا۔ کچھ ایسے بھی لوگ تھے۔ جو ہم لوگوں کی گفتگو اور شعر سننے آغا کے ہوٹل میں آ جاتے تھے جن کا ہمیں علم بھی نہ ہوتا تھا۔ دوسرے دن معمول کے مطابق تمام لوگ آغا کے ہوٹل میں اکٹھا ہو گئے۔ تقریباً ساڑھے دس بجے ایک شخص آیا اور اُس نے کہا۔ "آپ لوگ چلیے علی میاں مکان پر آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ ہم سب لوگ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ لیکن زخمی صاحب نے انکار کر دیا۔ آپ لوگ جائیے میں نہیں جاؤں گا۔ آخر کیوں؟ اس لیے کہ مجھے دعوت نہیں ہے۔ ہم نے کہا۔۔۔ زخمی صاحب کل خود علی میاں آپ کے سامنے ہم سب لوگوں کو دعوت دے گئے ہیں۔ اس میں آپ بھی شامل ہیں۔" نہیں میرے پاس کوئی تحریری دعوت نامہ نہیں آیا ہے۔" تحریری دعوت نامہ تو ہمارے پاس بھی نہیں ہے۔ مگر وہ خود آکر سب کو دعوت دے گئے ہیں۔ اور آپ کے تو وہ

خاص دوست ہیں۔" دوستی اپنی جگہ اور اصول اپنی جگہ میں کسی ایسی جگہ نہیں جاتا جہاں سے مجھے تحریری دعوت نامہ نہ ملے"۔ ہم لوگوں نے زخمی صاحب کو لاکھ سمجھایا مگر وہ کہاں ماننے والے تھے۔ آخر کار ہم لوگ انھیں تنہا چھوڑ کر علی میاں کے مکان پر پہنچے انتظار بے چینی سے ہو رہا تھا اور علی میاں نے اہتمام بھی مخصوص کیا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی کہنے لگے کہ "زخمی صاحب کیوں نہیں آئے"۔ ہم نے کہا کہ آپ نے انہیں تحریری دعوت نامہ نہیں دیا۔ اور وہ تحریری دعوت نامے کے بغیر کہیں نہیں جاتے اس لیے وہ آپ کے یہاں بھی نہیں آئے۔ یہ سنتے ہی علی میاں کا پارہ چڑھ گیا۔ جھلا کر بولے آئے گا کیوں نہیں؟ میں ابھی اسے لے کر آتا ہوں۔ چنانچہ تھوڑی ہی دیر میں دونوں دوست گلے میں باہیں ڈالے چلے آ رہے ہیں۔ سب ہی کو تعجب ہوا میں پوچھ بیٹھا۔ آپ تو تحریری دعوت نامہ کے بغیر آنے والے نہیں تھے۔ اب کیا ہوا؟ فوراً ہی جیب سے ایک کاغذ نکال کر دکھایا جس کا مطلب تھا میں نے تحریری طور پر دعوت نامہ لیا ہے جب آیا ہوں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ انھوں نے ہوٹل میں بیٹھ کر علی میاں سے پہلے دعوت نامہ تحریر کرا لیا تھا اس کے بعد وہاں سے چلے تھے۔ وہ نشست زخمی صاحب کی صدارت میں ہوئی تھی اور بہت خوبصورت نشست ہوئی۔ محمد علوی، عادل منصوری، جمیل کلیمی، زاغ صاحب، میرے علاوہ اور بھی دوست شعرا شریک تھے۔ محمد علوی کے دو شعر آج بھی ذہن میں ہیں اور اس نشست کی یادگار بھی۔

رات بیمار ستاروں سے بھری رہتی ہے\
دن کی قسمت میں وہی دردِ سری رہتی ہے

جام میں اپنا ہی چہرہ نظر آیا۔۔۔ ہم کو\
لوگ کہتے ہیں وہاں لال پری رہتی ہے

غالباً اسی زمانے میں آل انڈیا ریڈیو احمد آباد پر کچھ ایسے لوگوں کا تبادلہ ہو گیا جو اردو کے رسیا اور شعر و شاعری کے بہت دلدادہ تھے۔ یہ لوگ لکھنو حیدر آباد اور جے پور سے آئے تھے۔ چونکہ گجرات میں پہلی مرتبہ آئے تھے۔ اس لیے آکاش وانی کے گجراتی ماحول میں اپنے آپ کو جوڑ نہیں پاتے تھے۔

ان میں رائے صاحب حیدرآباد سے، منیر عالم صاحب لکھنؤ سے مشتاق احمد صاحب جے پور سے اور بھی دو شخص تھے جناب آہو جا صاحب، گوتم صاحب، اور گروناتھ صاحب ۔ یہ سب لوگ چونکہ اردو بولنے والے علاقوں سے آئے تھے ۔ اس لیے شاعری اور مشاعروں سے شغف تو ضروری تھا ہی ۔ یہ لوگ بڑے خلیق اور ملنسار تھے ۔ اس کا مجھے خود مشاہدہ ہے اس لیے کہ ان لوگوں نے آتے ہی اپنے خلوص و محبت اور ملنساری سے آکاش وانی کے سبھی لوگوں سے اچھے تعلقات استوار کر لیے تھے ۔ سبھی لوگ ان کی عزت کرتے تھے لیکن اس ماحول سے ان لوگوں کی سیری نہیں ہو پاتی تھی ۔ ان لوگوں نے احمد آباد کے ادبی حلقوں کے متعلق پوچھ تاچھ کی ۔ شعرا کے متعلق دریافت کیا ۔ اگر ان لوگوں کو ذرا بھی بھنک پڑ جاتی کہ آج احمد آباد میں فلاں جگہ مشاعرہ ہے ۔ یہ لوگ مع تمام ساتھیوں کے پہنچ جاتے ۔ اور دور کہیں کھڑے ہو کر اپنے ذوق کی تسکین کرتے ۔ ایسا ہی ایک روز ہوا کسی جگہ مشاعرہ تھا میں شریک تھا ۔ تقریباً رات کو ایک بجے میں کچھ دوستوں سے کہہ کر چائے پلانے کی غرض سے مشاعرہ گاہ سے باہر آیا ۔ جیسے ہی باہر آیا ۔ ایک نوجوان نے مجھے السلام علیکم کہہ کر مخاطب کیا ۔ اور مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا ۔ مجھے منیر عالم کہتے ہیں ۔ میں احمد آباد ریڈیو پر پروگرام ایگزیکیٹیو ہوں ۔ گیارہ بجے سے شام پانچ بجے تک آفس میں رہتا ہوں آپ کبھی تشریف لائیے ۔" میں نے کہا ۔" ضرور آؤں گا ۔ ملاقات بہت سرسری تھی ۔ چائے پان سگریٹ کی تواضع بھی میرے ہر چند منع کرنے پر بھی انہیں کی طرف سے ہوئی ۔ تقریباً ایک ہفتہ بعد شام کو میں آکاش وانی احمد آباد منیر عالم صاحب سے بغرض ملاقات گیا ۔ دیکھتے ہی مسرت کا اظہار کیا ۔ خندہ پیشانی سے پیش آئے ۔ کافی دیر تک احمد آباد کے ادبی حالات پر گفتگو ہوتی رہی اور وہ احمد آباد کے لوگوں کے متعلق تفصیل سے معلوم کرتے رہے ۔ میں نے کہا منیر عالم صاحب لوگ رات کو دس بجے کے بعد ایڈوانس سینما کے سامنے آغا کے ایرانی ہوٹل میں بیٹھتے ہیں ۔ آپ وہاں آجائیے تمام لوگوں سے ملاقات ہو جائے گی ۔ اور پھر اس کے بعد آغا کے ہوٹل میں محفل یاراں کے قافلے میں مزید اضافہ ہو گیا ۔ اور لوگ بھی آتے رہے ۔ کافی رات گئے تک محفل جمتی آغا کے ہوٹل کے بعد نہرو برج کے لان پر ہم لوگ چلے جایا کرتے تھے ۔

ایک روز دوران گفتگو مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کا ذکر نکل آیا ۔ ان کی خاموش طبیعت علمی و ادبی صلاحیت خلوص اور انکساری کی باتیں سن کر یہ لوگ بہت متاثر ہوئے ۔ اور ملاقات کی خواہش ظاہر کی ۔ دراصل حبیب الرحمٰن کی شخصیت گجرات میں ایک ہمہ گیر شخصیت تھی ۔ کوئی بھی شاعر ادیب یا عالم احمد آباد آئے وہ اس وقت تک اپنے احمد آباد کے سفر کو ادھورا ہی سمجھتا تھا ۔ جب تک حبیب الرحمٰن غزنوی سے ملاقات نہ کر لے ۔ غزنوی صاحب بہت متواضع آدمی تھے ۔ مہمانوں کی بہت عزت کرتے تھے ۔ بہت خلوص و محبت سے ملتے تھے اکثر لوگوں کو اپنے گھر کھانے پر مدعو کرتے تھے ۔ میں نے منیر عالم سے کہا کہ میں ایک یا دو روز میں حبیب الرحمٰن صاحب سے بات چیت کر کے وقت مقرر کر لوں گا ۔ اور آپ کو مطلع کر دوں گا ۔ چنانچہ دوسرے ہی روز میں نے مولانا سے تمام ماجرا کہا ۔ تمام حضرات کا مختصر مختصر تعارف کرایا ، اور کہا کہ یہ لوگ آپ سے ملنے کے خواہش مند ہیں ۔ مولانا کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ آپ اردو ، گجراتی ، عربی ، فارسی پر پورا عبور رکھتے تھے ۔ ایک مرتبہ تو میں نے مولانا کو ایک عرب کے ساتھ عربی میں فر فر بات کرتے سُنا ۔ اتنا سب کچھ ہوتے ہوئے بھی مولانا نے اپنے علم کی فوقیت کبھی نہیں جتائی ۔ مولانا چونکہ بہت ہی منکسر المزاج اور شریف النفس تھے اور ان کا مذاق بھی بہت شائستہ ہوتا تھا ۔ اسی لیے سب ہی ادیب شاعر ، عالم و فاضل مولانا کا احترام کرتے تھے ۔ مولانا کا حلقۂ احباب بھی بہت وسیع تھا ۔ دہلی میں عرش ملسیانی ، جگن ناتھ آزاد ۔ اور مالک رام گوپی چند نارنگ ، گوپال متل ، بسمل سعیدی ، مخمور سعیدی ، یہ سب مولانا کے احباب ہی نہیں مداح بھی تھے ۔ اور یہ سلسلہ دور دور شہروں میں پھیلا ہوا تھا ۔ مولانا نے سات مرتبہ فریضۂ حج ادا کیا ۔ مولانا کے انتقال کی خبر افریقہ اور برما کے اخباروں میں چھپی ۔ یہ بات مجھے افریقہ سے ایک شخص نے لکھی جب میں نے ان کو مولانا کے انتقال کی خبر دی تو جواب میں لکھا کہ یہ اطلاع مجھے وہاں کے مقامی اخباروں سے مل گئی تھی ۔ بہر حال دوسرے روز ملاقات کا وقت طے ہو گیا ۔

دوسرے روز میں منیر عالم اور دوسرے احباب کو لے کر وقت مقررہ پر پہنچ گیا ۔

مولانا سراپا انتظار تھے۔ ایک دوسرے کا تعارف ہوا اور ان کی آمد پر خوشی کا اظہار کیا۔ کافی دیر گفتگو رہی۔ چلتے وقت مولانا نے سب لوگوں کو اپنے یہاں کھانے کی دعوت دی۔ ہزار انکار کے باوجود مولانا نہیں مانے اور بضد رہے کہ کل شام کو آپ لوگوں کو یہیں کھانا پڑے گا۔ دعوت قبول کرلی گئی۔ کھانے میں اہتمام کافی کیا گیا تھا۔ بہت سلیقہ سے بہترین کھانے تیار کیے گئے تھے۔ ویسے مولانا احباب کی ضیافت کرکے بہت خوش ہوا کرتے تھے چونکہ میرے مولانا سے بہت قریبی تعلقات تھے۔ اور مکان بھی میری دکان کے سامنے ہے، اس لیے مجھے اکثر مواقع میسر ہوتے رہتے تھے۔ جب کبھی کوئی مہمان مولانا کے یہاں آتا' اور مولانا نے مجھ سے کہا۔ "رحمت صاحب آج رات کا کھانا میرے یہاں کھانا۔ ایک دو بار دہلی اور جے پور کے سفر میں بھی مولانا کے ساتھ رہا۔ مولانا کوئی فیصلہ بہت سوچ سمجھ کر کرتے تھے۔ فیصلہ کرنے کے بعد بہت اٹل رہتے تھے۔ مولانا نے اپنی ادبی اور صحافتی زندگی میں کبھی بھی اپنے قلم اور ضمیر کو فروخت نہیں کیا۔ حق گوئی اور بے باکی مولانا کا شیوہ تھا۔ اسی لیے مولانا کی شخصیت ہر دلعزیز شخصیت تھی۔ مولانا فریضۂ حج کے لیے کس دن روانہ ہوتے تھے کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی تھی اور نہ واپسی کی خبر، خاموش جاتے اور خاموش ہی واپس آتے تھے۔ مولانا کے اہل وعیال کے علاوہ کسی کو حج کے سفر کا علم نہ ہوتا تھا۔ نمود و نمائش سے مولانا پرہیز کرتے تھے۔ صرف ایک بیگ جس میں چار جوڑی کپڑے، یہ سامان ان کے سفر حج کا ہوتا تھا۔ دوسروں کے حج کے سلسلے میں مولانا کافی دوڑ دھوپ کرتے تھے۔ ویزا حاصل کرانا، نشستیں محفوظ کرانا، حجاج کے لیے سہولتیں مہیا کرانا۔ اس سلسلے میں اپنے خرچے سے بمبئی کے بار بار چکر لگاتے۔ ایک مرتبہ امیر الحجاج کی ذمہ داری بھی مولانا کے سپرد تھی۔ اور جدہ ریڈیو اسٹیشن سے مولانا کا انٹرویو بھی نشر ہوا تھا۔ انھیں سب خوبیوں نے مولانا کو ہر دلعزیز بنا دیا تھا۔ مولانا کے لڑکے سعید الرحمٰن غزنوی کی شادی پر تمام انتظام خاموشی کے ساتھ مولانا خود ہی کر رہے تھے۔ وہ اپنے نجی کام میں کسی کو زحمت نہیں دیتے تھے۔ مجھے جب معلوم ہوا تو میں مولانا کے پاس حاضر ہوا اور کہا کہ کوئی کام میرے لائق ہو تو کہیے۔ کہنے لگے سب ہو گیا ہے صرف رقعہ چھپنے کے لیے بھیج رہا ہوں۔ میں نے شادی کا رقعہ جب دیکھا اس پر ایک خاص نوٹ تھا۔

(لاگ نہیں لی جائے گی) گجرات میں یہ عام رواج ہے کہ شادی بیاہ کے موقع پر کچھ نہ کچھ ضرور دیا جاتا ہے۔ وہ چاہے تحفے کی شکل میں ہو چاہے نقد روپیہ زیادہ تر نقد روپے ہی دیے جاتے ہیں۔ اس لاگ کے لیے اردو میں اس لفظ کا بدل میرے ذہن میں لین دین آرہا ہے۔ حالانکہ لاگ بھی اردو کا ہی لفظ ہے۔ جو گجرات میں ایسے موقعوں پر مستعمل ہے۔ میں نے کہا مولانا آپ یہ نوٹ کیوں دے رہے ہیں۔ جبکہ آپ ہر جگہ دے کر آتے ہیں اور آپ کے یہاں تو یہ پہلا موقعہ ہے اور اس میں حرج بھی کیا ہے؟ یہ تو یہاں کا عام دستور ہے۔ ایسے موقعوں پر اس قسم کا لین دین ہوتا ہی ہے اور یہ کوئی معیوب بات بھی نہیں ہے۔ لیکن مولانا اپنی بات پر اٹل رہے۔ "رحمت صاحب میں نے یہ فیصلہ کرلیا ہے۔ اب اس میں ردوبدل نہیں ہوگا۔ اور میں کسی کا مشورہ قبول نہیں کروں گا۔ کافی سمجھانے پر بھی مولانا نے میری بات قبول نہیں کی۔ اور دعوت نامے اسی طرح چھپ کر آئے اور تقسیم بھی ہو گئے۔ شادی کے بعد مولانا نے ایک مشاعرے کا بھی اہتمام کیا تھا۔ چونکہ شادی میں شرکت کے لیے دہلی سے مولانا کے احباب بھی آئے تھے جن میں گوپال متل اور نسیم عباسی بھی شامل تھے اور ان لوگوں کی واپسی کا ریزرویشن بھی اپنی جیب سے کرایا تھا۔ شادی کے دن جب مہمانوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا۔ مولانا مکان کے باہر سڑک پر کھڑے ہوئے مہمانوں کا استقبال کر رہے تھے۔ جو لوگ رکشا میں بیٹھ کر آتے تھے ان کے رکشے کا کرایہ مولانا خود ادا کرتے۔ یہ منظر خود میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا، اور اسی پر بس نہیں واپسی پر کچھ دور جانے والے احباب کو خود ہی رکشا میں سوار کراتے ہزار اصرار کے باوجود خود ہی رکشا والے کو کرایہ دے دیا کرتے تھے۔ مشاعرے والے روز بھی یہی عالم رہا۔ شہر کے سبھی اچھے شعرا اس مشاعرے میں شریک تھے۔ اور مہمان خصوصی جناب قتیل صاحب کی صدارت میں بہت عمدہ طریقہ سے مشاعرہ رات کو دو بجے ختم ہوا۔ قتیل احمد آبادی جو کبھی کسی مشاعرے میں شرکت نہیں کرتے تھے۔ کم از کم میں نے تو انھیں کسی مشاعرے میں نہیں دیکھا۔ لیکن مولانا کے یہاں جب بھی کوئی نشست یا مشاعرہ ہوا۔ قتیل صاحب نے ضرور شرکت کی۔ قتیل صاحب کا اردو فارسی کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ عروض پر بھی دسترس حاصل ہے۔ بہت سلجھے ہوئے شعر کہتے ہیں۔ شعر کی خوبیوں اور خامیوں

پر بہت گہری نظر رکھتے تھے لیکن مزاج کچھ مجذوبانہ پایا ہے۔ باتیں بہت رُک رُک کر کرتے ہیں۔ پہلی ملاقات میں کسی کو محسوس نہیں ہوپاتا کہ یہ شخص اتنی صلاحیتوں کا مالک ہے۔ قریش جماعت کے سبھی شعرا جمال قریشی، جمیل تعلیمی نے اُن کی صلاحیتوں کا اعتراف کیا ہے۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ مولانا حبیب الرحمٰن غزنوی نے اپنے مکان پر مشاعرے کا اہتمام کیا۔ اس مشاعرے میں خاص طور سے احمد آباد ریڈیو اسٹیشن پر جو نیا اسٹاف آیا تھا جس کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے۔ یہ مشاعرہ ان تمام لوگوں کے اعزاز میں تھا۔ ان تمام لوگوں کو مولانا نے اپنے یہاں کھانے پر مدعو کیا تھا۔ مشاعرہ جناب آہو جہ صاحب کی صدارت میں تھا۔ اس میں شریک ان کی بیوی بھی ہوئی تھیں جو غالباً لکھنؤ یا حیدر آباد کی تھیں اور اردو سے خاص شغف تھا۔ مشاعرہ بہت صاف ستھرا تھا اور عوام کی تعداد جتنی بھی تھی وہ سب ہی بہت باذوق تھے۔ مشاعرے کے اناؤنسر مسٹر گروناتھ جی تھے جو آل انڈیا ریڈیو کے اُس وقت اناؤنسر تھے۔ اس مشاعرے میں ایک عجیب واقعہ رُونما ہوا۔ اس واقعہ کا سارا الزام راقم الحروف پر آتا ہے۔ قصّہ کچھ اس طرح تھا کہ حکیم بشیر احمد خاں زخمی جنھیں سب لوگ چچا کہتے تھے۔ اور میں بھی نہایت احترام کے ساتھ انھیں چچا ہی کہتا تھا۔ چچا کی عادت میں شمار تھا کہ وہ ذرا سی غلطی بھی برداشت نہیں کرپاتے تھے اور بر سرِ مشاعرہ کسی نہ کسی طریقے سے پڑھنے والے شاعر کو ٹوک دیا کرتے تھے (میاں پھر عنایت فرمایئے) بھئی کیا خوب کہا ہے، مکرّر ارشاد، یہ آپ ہی کا حصّہ ہے) یہ اور اسی قسم کے نہ جانے کتنے جملے کس دیا کرتے تھے۔ مشاعرے کے تمام شعرا کو باور کرا دیا کرتے تھے کہ شعر میں سقم ہے۔ یہ بات کم سے کم مجھے تو بہت ناگوار گزرتی تھی۔ دوسرے لوگ بھلے ہی لطف لیتے ہوں، حالانکہ ایسا میرے ساتھ کبھی نہیں ہوا۔ میں نے ایک بار زخمی صاحب سے کہہ بھی دیا۔ "چچا آپ کی یہ عادت اچھی نہیں ہے۔ آپ شاعر کو بر سرِ مشاعرہ ٹوک دیتے ہیں۔ اگر کوئی عیب ہے بھی، تو آپ مشاعرے کے بعد تنہائی میں اس کو بتا دیا کریں کہ بھئی تمہارے فلاں شعر میں یہ عیب ہے۔" دیکھو رحمت صاحب میں نے آج تک کسی نومشق شاعر کو نہیں ٹوکا، جب بھی اچھا شعر

سننے کو ملا میں نے دل کھول کر اس کی تعریف کی ہے اور داد دیتا ہوں۔ لیکن جب مجھے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ فلاں شاعر نے بھی اپنے دو چار شاگرد بنا لیے ہیں اور خود کو اساتذہ کی صف میں شمار کرتا ہے۔ تب میں اس کو کسی طرح نہیں بخشتا۔ بات بظاہر معقول تھی۔ لیکن پھر بھی چچا زخمی کی یہ عادت مجھے ٹھیک نہیں لگی۔ اور اس وقت مزاج بھی کافی ہنگامہ پسند تھا۔ لڑائیاں مول لینے میں لُطف آتا تھا۔ زخمی صاحب اور نصیر صاحب کے درمیان کچھ ان بَن تو تھی ہی اس سے میں نے فائدہ اُٹھاتے ہوئے ایک پلان تیار کیا جس میں نصیر صاحب کو اپنا ہمنوا بنا لیا۔ اور طے یہ ہوا کہ نصیر صاحب اب جب کسی مشاعرے میں غزل پڑھیں گے مطلع سنانے کے بعد غزل کی بحر اور ارکان وغیرہ بتا دیا کریں گے۔ نصیر صاحب کو بھی عروض وغیرہ کا علم تھا۔ اور فارسی زبان سے بھی واقفیت تھی۔ وہ شاعری کے معاملے میں شعر بالکل روایتی قسم کے کہتے تھے۔ لیکن پڑھتے بڑی گھن گرج کے ساتھ تھے۔ اب نصیر صاحب کا یہ معمول بن گیا کہ وہ ہر مشاعرے میں غزل سُنانے کے ساتھ اُس کی بحر اور اوزان کا بھی اعلان کر دیتے۔ تھوڑے ہی دنوں میں یہ بات پورے شہر میں مشہور ہو گئی کہ نصیر صاحب غزل سُناتے وقت اس کی بحر اور اوزان کا بھی اعلان کر دیتے ہیں۔ دراصل کوئی کتنا ہی بڑا عروض داں ہو، تمام بحریں اس کو ازبر نہیں ہوتیں۔ صرف وہ رواں دواں بحریں جن میں عام شعرا اکثر غزلیں کہتے رہتے ہیں یاد رہتی ہیں اور کچھ شعرا نے ایسی غیر مستعمل بحروں میں طبع آزمائی کی ہے۔ اور اُن کے دواوین میں کچھ ایسی غزلیں ملتی ہیں۔ مولانا حبیب الرحمٰن غزنوی کے مکان پر مشاعرہ کا اعلان ہو چکا تھا۔ میں نے نصیر صاحب کے لیے ایسی ہی ایک غیر مستعمل بحر کا انتخاب کیا۔ "ہائے کہ رونے پہ اختیار نہیں" نصیر صاحب نے اس زمین میں غزل کہہ ڈالی۔ اور طے یہ ہوا کہ مشاعرے میں آپ ارکان اور بحر وغیرہ نہ بتائیں آپ غزل شروع کر دیں۔ اور جب آپ غزل پڑھیں گے میں آپ سے کہوں گا نصیر صاحب آج آپ بحر وغیرہ کیوں نہیں بتا رہے ہیں۔ غزل کی بحر کا اعلان کیجیے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ نصیر صاحب نے غزل شروع کی اور میں نے فرمایش کی۔ آج آپ معمول کے خلاف کیوں جا رہے ہیں۔ غزل کی بحر اور ارکان وغیرہ بتا دیجیے۔

نصیر صاحب نے برجستہ زخمی صاحب کی طرف اشارہ کیا۔ اور کہا بھئی ہر مرتبہ مشاعرے میں میں غزل کی بحر اور اوزان بتاتا ہوں۔ آج آپ استاد زخمی صاحب سے پوچھ لیجیے یہ بتادیں گے۔ بس پھر کیا تھا مشاعرہ ختم گیا۔ اور زخمی صاحب اپنی جگہ خاموش۔ "پڑھیے پڑھیے" نصیر صاحب سے زخمی صاحب نے کہا۔ اور نصیر صاحب نے جواب دیا کہ زخمی صاحب یہ بچے معلوم کر رہے ہیں تو بتا دیجیے۔ بحر اور ارکان۔ زخمی صاحب کی حالت قابل دید تھی اور ادھر نصیر صاحب مشاعرے کو اسٹاپ کیے کھڑے تھے۔ اندازہ لگائیے اس وقت کیا منظر ہوگا۔ کافی دیر ہوگئی۔ اس ہنگامے سے مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نے بھی لطف لیا۔ اور آخر کار زخمی صاحب کی طرف اشارہ کرکے کہا۔ "زخمی صاحب کہہ دیجیے بحرِ بیکراں"۔ تھوڑی دیر ہنگامے کے بعد نصیر صاحب نے بحر اور اوزان بتائے اور پھر مشاعرہ آگے بڑھا۔ اس واقعہ سے میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ زخمی صاحب فنِ عروض سے نابلد تھے زخمی صاحب عروض اچھی طرح جانتے تھے۔ کیونکہ بحر نامانوس تھی اس لیے فوراً ذہن میں آنا مشکل تھا اور نصیر صاحب تیاری کرکے آئے تھے۔ ورنہ زخمی صاحب کسی طرح بھی نصیر صاحب سے کم نہیں تھے۔

آج جب اس واقعہ کی یاد آتی ہے تو دل میں خیال آتا ہے کہ میں نے اچھا نہیں کیا۔ زخمی صاحب کی عادت میں شمار تھا کہ وہ ہمیشہ مشاعرے میں غزل ترنم سے پڑھتے تھے جتنے اچھے شعر کہتے تھے اتنا ہی خراب ترنم تھا۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ ایک اچھی غزل خراب ہو جاتی تھی اور ہمیشہ مشاعروں میں سپاٹ جاتے تھے۔ ٹاؤن ہال احمد آباد میں انڈو پاک مشاعرہ تھا۔ یہ مشاعرہ مدیر "شاعر" اعجاز صدیقی کی صدارت میں ہو رہا تھا۔ پاکستان سے منظر صدیقی، قتیل شفائی، ماہر القادری تشریف لائے تھے۔ ہندستان سے روش صدیقی معین احسن جذبی، سیدہ اختر، راہی معصوم رضا، کرشن بہاری نور، اور ان کے علاوہ ہندستان کے معروف شعرا کی خاصی تعداد تھی۔ زخمی صاحب کے نام کا اعلان ہوا۔ اس سے کچھ دیر قبل زخمی صاحب نے بیاض نکال کر اوراق پلٹنے شروع کر دیے۔ قریب ہی مولانا حبیب الرحمٰن بیٹھے تھے۔ ان کی طرف اشارہ

کرکے زخمی صاحب نے مشورہ چاہا۔ مولانا کون سی غزل پڑھوں؟ قریب ہی میں بیٹھا ہوا تھا۔ مولانا نے لاپرواہی سے بیاض کا جو صفحہ کھلا ہوا تھا اس کی طرف اشارہ کرکے کہا "یہی غزل پڑھ دیجیے۔" زخمی صاحب نے وہی غزل پڑھی۔ اول تو اتنے بڑے مشاعرے میں مقامی شاعر کی حالت ویسے ہی نازک ہوتی ہے۔ اس پر زخمی صاحب کا بھدا ترنم۔ غزل بالکل سپاٹ گئی۔ احباب نے کتنی ہی مرتبہ زخمی صاحب سے کہا کہ چچا آپ ترنم سے نہ پڑھا کریں مگر چچا کہاں ماننے والے تھے۔ مرتے دم تک ترنم کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ مشاعرے کے دوسرے روز سب احباب جمع ہوئے مولانا غزنوی بھی موجود تھے۔ دوستوں نے زخمی صاحب سے کہا۔ آپ بھی رات مشاعرے میں یہ کون سی غزل لے بیٹھے تھے۔ اس پر زخمی صاحب نے جواب دیا۔ بھئی کیا کروں مولانا نے کہا یہ غزل پڑھ دو۔ میں نے وہی غزل پڑھ دی۔ مولانا کہاں چوکنے والے تھے۔ برجستہ جواب دیا۔ "زخمی صاحب رات آپ کوئی بھی غزل پڑھتے کوئی فرق نہیں پڑنے والا تھا یہی حشر ہوتا۔"

نواب مہدی نواز جنگ گجرات کے گورنر اول ہوکر آئے تھے۔ شعر و شاعری کے بڑے دلدادہ تھے۔ آتے ہی احمد آباد کے شعرا کے متعلق معلومات فراہم کیں اور گورنر ہاؤس میں ایک مشاعرے کا انتظام کیا۔ اس مشاعرے میں زخمی صاحب، محمد علوی، عادل منصوری، رسول میاں شیخ، اسمٰعیل خالدی، جمال قریشی، جمیل کلیمی، اور راقم الحروف نے شرکت کی تھی۔

اس کے بعد گورنر ہاؤس میں مشاعروں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ جب بھی کوئی منسٹر یا گورنر صاحب کا مہمان آتا نشست کا انتظام ضرور ہوتا اور ہر دوسرے تیسرے ماہ اس طرح کا پروگرام بنتا رہتا تھا۔ مہدی نواز جنگ صاحب شعرا کو ہمیشہ تحائف سے نوازتے تھے اور بڑے آداب کے ساتھ یہ خوبصورت نشست ہوتی تھی۔ گورنر صاحب کی گاڑی ہمیشہ شعرا کو لینے اور واپس چھوڑنے آتی تھی۔ اور جب تک مہدی نواز جنگ احمد آباد میں رہے یہ سلسلہ چلتا رہا اور یہ تمام لوگ اس میں شرکت کرتے رہے۔ اس وقت گورنر ہاؤس کے دروازے شاعروں کے لیے کھلے رہتے تھے۔ حیدرآباد کے شعرا بھی مہمان بن کر آتے تھے۔ ان میں مخدوم محی الدین

سکندر علی وجد، نصیرالدین ہاشمی، سلیمان اریب، سرور ڈنڈا، عابد حسین، صالحہ عابد حسین اور ان لوگوں کے اعزاز میں گورنر ہاؤس میں اکثر نشستیں ہوا کرتی تھیں۔ اب یہ باتیں خواب و خیال ہو گئی ہیں۔ اُنھیں دنوں آل انڈیا ریڈیو کے مشاعرے میں ڈروده سے کشش اور خلش کے چھوٹے بھائی قمر بڑودوی مدعو تھے۔ احمد آباد سے حزیں قریشی، جمال قریشی، اور میں شامل تھا۔ نہ جانے کس پالیسی کے پیشِ نظر خلش، محمد علوی اور رحمی صاحب کو اس مشاعرے سے نظرانداز کر دیا گیا تھا۔ حالانکہ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ یہ مشاعرہ رات کے دس بجے سے ساڑھے گیارہ بجے تک نشر ہوا تھا۔

مشاعرے کا کافی چرچا تھا۔ اس مشاعرے کا اثر ہمارے حلقۂ احباب پر نہیں پڑا۔ ہم سبھی لوگ برابر اسی طرح ملتے رہے اور نہ کوئی آپس میں اختلاف ہوا اب میں اس واقعہ کا ذکر کر رہا ہوں۔ اس کا علم مولانا حبیب الرحمن غزنوی کے انتقال کے بعد ان کی ڈائری دیکھنے پر معلوم ہوا۔ جو وہ روزانہ لکھا کرتے تھے اس وقت احمد آباد ریڈیو اسٹیشن سے اردو پروگرام نہیں ہوتے تھے۔ بہرکیف مولانا حبیب الرحمن غزنوی کو کسی خاص موضوع پر تقریر کرنے کے لیے دعوت نامہ موصول ہوا۔

مولانا اپنی ڈائری میں لکھتے ہیں "۱۲ر مارچ آج کی ڈاک سے مجھے ریڈیو کی طرف سے تقریر کرنے کے لیے دعوت نامہ وصول ہوا ہے۔ عجب کشمکش میں ہوں کیا جواب دوں۔ ابھی چار روز قبل میں نے ان تمام لوگوں کی اپنے یہاں دعوت کی تھی اور ان کے اعزاز میں مشاعرہ بھی رکھا تھا۔ اب ریڈیو پر تقریر کرنے جاتا ہوں تو سوچتا ہوں لوگ کیا کہیں گے۔ مولانا نے یہ سب کچھ اس لیے کیا تھا اور ریڈیو والوں نے اس کا یہ صلہ دیا ہے۔ اس قسم کی باتیں ضرور ہونگی اگر انکار کرتا ہوں تو منیر عالم اور رحمت صاحب کی دل شکنی ہوگی۔ اس لیے کہ رحمت صاحب ہی نے ان سب لوگوں سے ملایا ہے اور یہ سب لوگ بہت مخلص ہیں۔"

"۱۴ر مارچ۔ سوچ رہا ہوں کہ انکار کر دوں، بڑی اُلجھن میں ہوں کچھ فیصلہ

نہیں کر پا رہا ہوں۔ ۱۵ر مارچ

"۱۵ر مارچ۔ آج میں آج میں نے احمد آباد ریڈیو سے انکار کر دیا اور ایگریمنٹ واپس کر دیا اُنھیں لکھ دیا کہ آپ نے جو کام میرے سپرد کیا ہے۔ میں اُس کے لیے موزوں نہیں ہوں۔ کسی دوسرے شخص کو تلاش کر لیجیے۔ مہربانی ہوگی۔"

"۱۶ر مارچ۔ آج ریڈیو والی اُلجھن ختم ہو گئی اور اب میں ذہنی طور پر اپنے آپ کو مطمئن پا رہا ہوں۔ میرا ضمیر کہہ رہا ہے کہ میں نے ٹھیک ہی فیصلہ کیا ہے۔"

ہماری اس محفلِ یاراں کی اہم شخصیت مولانا فخرالدین ندوی تھے۔ سوچتا ہوں کہ ندوی صاحب نہ شاعر تھے نہ ادیب اور نہ بالکل مولوی، پھر بھی نہ جانے ان میں کون سی کشش تھی کہ ان کے بغیر محفل سونی لگتی تھی جس دن بھی ندوی صاحب غیر حاضر رہتے یا تاخیر سے آتے ہر ایک کی زبان پر یہی ہوتا۔ کیوں آج ندوی صاحب نہیں آئے۔ اور جب تک ندوی صاحب آ نہیں جاتے محفل میں ایک کمی سی محسوس ہوتی۔ عجیب باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے اگر کسی سے ناراض ہو جائیں تو ناراضگی کا اظہار اتنے کھل کر کریں کہ اس میں ہزار بُرائیاں نکال دیں۔ اور اگر کسی سے خوش تو اتنے خوش کہ اس کی تعریفیں کر کے آسمان پر بٹھا دیں۔ ویسے ندوی صاحب اپنی وضع پر قائم تھے۔ جمیل صاحب سے گہرے مراسم تھے۔ اور ان کے انتقال کے بعد ان کے بچے شاہد و خالد وغیرہ اسی خلوص و محبت سے پیش آتے رہے۔ جمیل صاحب کے لڑکے شاہد اور خالد بھی اپنے والد کے احباب کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ میں جب بھی دوکان پر جاتا ہوں جمیل صاحب کی کمی شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ لیکن کلیم بکڈپو پر پہنچنے کے بعد ان کے بچوں کا ادب خلوص اور محبت دیکھنے کے بعد کسی اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ ایسی لائق اور سعادت مند اولاد سب کو عطا کرے۔ جمیل صاحب بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔ دُکان کے اوقات میں بھی احباب کا خاص خیال رکھتے تھے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ دُکان پر گاہک زیادہ ہیں۔ اور جمیل صاحب ان سے بات چیت میں مصروف ہیں۔ کتابیں نکال کر دے رہے ہیں قیمت بتا رہے ہیں۔ لیکن اس مصروفیت میں بھی اگر کچھ احباب دُکان پر کھڑے ہیں تو تھوڑی تھوڑی دیر میں احباب کی مزاج پرسی بھی کر رہے ہیں، دُکانداری

بھی ہو رہی ہے اور احباب کا خیال بھی ہو رہا ہے اور یہ باور کراتے رہتے کہ مجھے آپ لوگوں کی موجودگی کا احساس ہے۔

جمیل صاحب اتنی کاروباری مصروفیت کے باوجود بھی ہر ماہ پانچ چھ غزلیں کہہ لیا کرتے تھے۔ ویسے ہم لوگ ہر ماہ ایک مصرعہ منتخب کر لیا کرتے تھے جس پر سبھی احباب غزلیں کہا کرتے تھے اور یہ طرحی نشست کبھی محمد علوی کے مکان پر کبھی جمیل صاحب کے یہاں کبھی ریلیف روڈ پر ایک نائٹ اسکول میں، مگر زیادہ تر طرحی نشستیں محمد علوی کے مکان پر ہی ہوتی تھیں۔

انہی دنوں میں "ادبی سرکل" کے نام سے ایک بزم کا اہتمام ہوا تھا جس کے سکریٹری عادل منصوری تھے۔ اور جوائنٹ سکریٹری راقم الحروف اس بزم میں تنقید و مباحثہ ہوتا تھا۔ ماہانہ نشستیں ہوتی تھیں۔ جس میں اس حلقۂ احباب کے باہر کے لوگ بھی شرکت کرتے۔ لیکن کچھ ہی دنوں میں ہنگاموں کی نذر ہو گئی۔ ورنہ یہ سلسلہ بہت اچھا تھا۔ اب اس حلقہ کی نشست میں آغا ہوٹل کے علاوہ امپیریل ہوٹل ریلیف روڈ کا اضافہ بھی ہو گیا تھا۔ یہاں پر سب لوگ اکٹھے ہو جایا کرتے تھے۔ ہمارے حلقے میں صرف عادل منصوری ایسے تھے جن کی شاعری کا ابتدائی زمانہ تھا۔ باقی سب سنیئر تھے۔ عادل منصوری پہلے سے بہت ذہین تھے۔ اور ابتدا ہی سے اچھے شعر کہتے تھے۔ عادل منصوری نے پہلی غزل بہت خوبصورت کہی تھی۔ جس میں ایک شعر تو بہت ہی خوبصورت تھا۔ آج بھی مجھے اس غزل کا ایک مطلع اور یہ شعر یاد ہے۔

نہ جانیئے نگر نگر ہمارے دل سے پوچھیے!
کہاں ہے ان کی رہ گزر ہمارے دل سے پوچھیے

رگوں میں جتنا خون تھا چراغِ شب کو دیدیا
حضور قیمت سحر ہمارے دل سے پوچھیے

عادل منصوری آج بھی شعر کہتے ہیں اور گجراتی کے ساتھ ساتھ اردو ادب میں بھی ان کا مقام ہے۔ رسول میاں شیخ اس زمانہ میں بھی شعر کہتے تھے۔ لیکن ان کا خاص شوق ڈرامہ نگاری ہے۔ ان کے کئی ڈرامے رسالہ شاعر میں شائع ہوئے۔

رسول میاں شروع ہی سے بہترین صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ لیکن نہ جانے کیوں وہ ایک طویل عرصے سے خاموش ہیں۔

اس زمانے میں مشاعرے بہت صاف ستھرے ماحول میں بڑے سلیقے سے ہوا کرتے تھے۔ شعرا کے مرتبے کا خیال رکھا جاتا تھا۔ فخر احمد آبادی، عادل دہلوی حزیں قریشی، کلیم احمد آبادی کو میں نے دو تین مشاعروں میں سنا ہے۔ بعد میں ضعیفی کی وجہ سے آنا جانا ترک کر دیا تھا۔ آخری ایام میں بصارت سے محروم ہو گئے تھے اور سماعت بھی کچھ کمزور ہو گئی تھی۔ جتنے اچھے شعر کہتے تھے۔ اتنے ہی اچھے ترنم سے پڑھتے تھے۔ محفل میں ایک وجد کی سی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ جس وقت وہ ترنم سے غزل پڑھتے تھے۔ یہ منظر میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اوپر میں نے حبیب الرحمن کے مکان کا ذکر کیا ہے۔ اس میں کلیم احمد آبادی شامل تھے۔ اس کے علاوہ محمد علوی نے پریما بھائی ہال میں ایک مشاعرے کا اہتمام کیا تھا۔ کون سا سال تھا وہ اس وقت ذہن میں نہیں ہے لیکن اتنا یاد ہے، کہ مشاعرہ شروع ہونے کے بعد میں ایک صاحب اور تھے۔ کلیم صاحب کو گھر سے مشاعرہ گاہ لے کر آئے تھے اور بدقت تمام ان کو سہارا دے کر اسٹیج تک پہنچایا تھا۔ کلیم صاحب کے صاحبزادے جمیل کلیمی اکثر اپنے والد کو شہر میں ہونے والوں مشاعروں کی روئداد سے روشناس کراتے رہتے تھے۔ اور کبھی کبھی طرحی مشاعروں کے اشعار بھی والد صاحب کو سنایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ جمیل صاحب نے کہا کہ رحمت صاحب کل ہم نے آپ کی غزل کے دو شعر کلیم صاحب کو سنائے۔ بہت خوش ہوئے اور تمھیں یاد کر رہے ہیں۔ میں کلیم صاحب سے اُن کے مکان پر جا کر ملا ہوں اپنے شعر بھی سنائے ہیں اور انھوں نے بھی از راہِ عنایت مجھے شعر سنائے ہیں۔ پرانی وضع قطع کے بہت مخلص اور ملنسار آدمی تھے۔ ان کا ایک مجموعہ متاعِ کلیم، جمیل صاحب نے ان کی زندگی ہی میں شائع کر دیا تھا۔ قریشی جماعت اور احمد آباد کے عوام نے مل کر کلیم صاحب کا جشن بہت خوبصورت ڈھنگ سے منایا تھا۔ غالباً پورے ہندستان میں جشن منانے کا یہ پہلا پروگرام تھا۔ اس سے پہلے ہندستان میں شاعر کی زندگی میں اس کا جشن اس طرح نہیں منایا جاتا تھا۔ اور اس کی پہل کا سہرا بھی احمد آبادی کے سر ہے۔ اس کے بعد ہندستان میں اس قسم کے پروگرام

شروع ہوئے۔ یہ تین روزہ پروگرام تھا۔ آخری روز مشاعرہ تھا۔ جگن ناتھ آزاد دہلی سے مشاعرہ میں دو روز قبل احمد آباد آگئے تھے۔ حالانکہ یہ ایام دیوالی کے تھے۔ جشن کے پہلے روز جگن ناتھ آزاد نے عوام کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"حضرات! مجھے مشاعرے کی دعوت ملی تھی مگر میں دو روز قبل ہی دیوالی چھوڑ کر احمد آباد آگیا ہوں جس کی وجہ صرف یہ ہے کہ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ ایک شاعر کی زندگی میں اس کا جشن کس طرح منایا جاتا ہے۔ میں دہلی جاکر اپنے احباب اور وہاں کے لوگوں سے کہوں گا کہ تمہیں بھی شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی اور دوسرے اساتذہ کا جشن منانا چاہیئے جن شعرا کے دم سے مشاعروں میں رونق ہوتی تھی۔ کچھ کا ذکر میں اوپر کر چکا ہوں جمال قریشی، خلش بڑودوی، زاغ ٹونکی، استاد سمیع خاں، نادم اندوری، نزار حسین آخر، تاج ٹونکی، عاشق جونپوری، وحید بنارسی کے نام قابل ذکر ہیں۔

آغا کے ہوٹل والی محفل جمتی رہی۔ ہزار اختلاف ہوتے تھے جھگڑے ہوتے تھے، مگر آتے تھے بدستور اگر اس آغا کے ہوٹل والی محفل کو محفل یاراں کے بجائے "زمرۂ غم نباشد" کا نام دیا جائے تو بیجا نہ ہوگا اس لیے کہ کچھ گھنٹے یہاں بیٹھ کر دن بھر کی تلخی اور تھکن دور ہو جاتی تھی۔ دل و دماغ کے لیے ادبی تفریح کا سامان مہیا ہوتا تھا۔ آغا کے ہوٹل کی نشست جب تک رہی میں نے کبھی کبھی یہ نہیں سنا کہ آج چائے کا بل فلاں صاحب دیں گے۔ روزانہ ہر شخص اس سلسلے میں پہل کرتا تھا۔ اور آخر میں کچھ احباب مل کر فیصلہ صادر کرتے "چلیے صاحب آج انہیں بل ادا کرنے دیجیے۔ اکثر زخمی صاحب اور محمد علوی صاحب بل ادا کرتے تھے لیکن اس سلسلے میں میں نے کوئی اختلاف نہیں دیکھا۔

ورنہ آج کے زمانے میں ایسی نشستیں اتنے لمبے عرصے تک نہیں چل سکتیں۔ آخر میں آغا کے ہوٹل کا ایک واقعہ اور سن لیجیے۔ جو خالی از لطف نہ ہوگا۔ ہوٹل کے مالک آغا چونکہ ایرانی تھے۔ اس لیے مادری زبان فارسی تھی۔ چچا زخمی ان کے ساتھ اکثر فارسی میں گفتگو کرتے تھے۔ جواب میں آغا بھی کچھ فارسی اشعار سنا دیا کرتے تھے آغا ہم لوگوں سے بہت مانوس تھے اور جانتے تھے کہ یہ سب شاعر لوگ ہیں اس لیے عزت بھی کیا کرتے تھے۔

ایک روز محفل جمی ہوئی تھی۔ غالباً سبھی لوگ موجود تھے۔ آغا کے ہوٹل بند کرنے کا

ٹائم گیارہ بجے کا تھا اور لائسنس بھی گیارہ بجے کا تھا۔ سب سے آخر میں ہم لوگ اٹھ جایا کرتے تھے۔ کبھی ایسا بھی ہوا سوا گیارہ بج گئے ہیں۔ تب ہم لوگ اٹھے ہیں۔ ایک روز باتوں میں ایسے منہمک ہوئے کہ وقت کا پتا ہی نہ چلا۔ ساڑھے گیارہ بج گئے۔ ہوٹل خالی ہوگیا۔ اور ہم لوگ محو گفتگو۔ کسی خاص موضوع پر بات چل رہی تھی۔ یہاں تک کہ جھاڑو دینے والا نوکر بھی جھاڑو لگا کر چلتا بنا آغا کاؤنٹر پر بیٹھے سوچ رہے ہیں کہ ان لوگوں سے کس طرح کہا جائے کہ بھائی صاحب مجھے گھر جانا ہے۔ ہوٹل بند ہونے کا وقت ہو چکا ہے۔ آغا صاحب کافی دیر تک عجیب کشمکش میں مبتلا رہے اور ہم لوگوں پر یہ بات ظاہر کرنے کے لیے سوچتے رہے۔ ادھر ہم لوگ سارے عالم سے بے خبر بحث مباحثے میں مصروف۔

آخر کار آغا صاحب کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔ ادھر گھڑی نے پونے بارہ بجائے آغا صاحب کاؤنٹر سے اٹھے اور نہایت ہی متانت اور سنجیدگی کے ساتھ چابیوں کا گچھا اور ہوٹل کا لائسنس ہمارے میز پر رکھ کر کہنے لگے۔ "آپ لوگ ہوٹل بند کر دینا۔ ہم اب گھر جاتا ہے بارہ بجنے کو آتا ہے، کوئی آئے آپ شاعر ہو، جواب دے دینا۔ یہ لائسنس گیارہ بجے کا ہے"۔ یہ سنتے ہی آغا کی ذہانت پر ہم لوگ خوش ہوئے اور فوراً ہی سب لوگ کھڑے ہوگئے اور سب نے نہرو برج کا رخ کیا۔ اس مضمون میں جن لوگوں کا ذکر کیا ہے۔ ان میں جمیل کلیمی صاحب، حبیب الرحمن غزنوی، نصیر صاحب، زخمی صاحب دہلوی، عادل دہلوی، وحید بنارسی، حزیں قریشی، آج اس دنیا میں نہیں ہیں صرف ان کی یاد باقی ہے۔ ع:

"زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے"

انجمن ترقی پسند مصنّفین کی تاریخی کانفرنس

پہلا اجلاس
مورخہ ۵ رجولائی بروز سنیچر ۱۹۴۷ء
وقت دس بجے شب

انجمن ترقی پسند مصنفین اردو احمد آباد کی جانب سے پانچ اور چھے جولائی کو ہندستان بھر کے ترقی پسند ادیبوں کی ایک نہایت ہی شاندار کانفرنس احمد آباد میں منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس میں شریک ہونے کے لیے جوش ملیح آبادی۔ کرشن چندر، سجاد ظہیر، علی سردار جعفری، اسرار الحق مجاز، مجروح سلطان پوری، ممتاز حسین، نیاز حیدر، حمید اختر، ادا کار رومانی، راشد حسین سنیچر کی صبح کو احمد آباد تشریف لائے۔ اسٹیشن پر مقامی شاخ کے ممبروں نے آنے والے حضرات کا استقبال کیا۔

خواجہ احمد عباس فراق گورکھپوری اور ساغر نظامی چند خاص وجوہات کی بنا پر کانفرنس میں شریک نہ ہو سکے۔

کانفرنس کا پہلا اجلاس ۵ رجولائی شب میں دس بجے شروع ہوا۔ دس بجے کے قریب جب تمام شعرا و ادبا ہال میں داخل ہوئے تو ہال تالیوں کے شور سے گونج اٹھا جلسہ شروع ہونے پر وارث حسین علوی نے آج کے جلسے کی صدارت کے لیے کرشن چندر کا نام پیش کیا۔ جس کی تائید سید سجاد ظہیر نے کی.....

کرشن چندر نے نہایت ہی پُرسکون طریقے پر اپنا خطبۂ صدارت پڑھتے ہوئے

بتایا کہ ترقی پسند مصنفین اُن باتوں پر بہت کچھ سوچ بچار کر چکے ہیں۔ جن کا تعلق ہماری زبان اور ہمارے ادب سے ہے۔ لیکن آج ہمیں اُن کے متعلق پھر سے کچھ سوچنا ہے کیونکہ آج حالات مختلف ہیں آج سے بارہ ماہ پہلے حالات ایسے نہ تھے۔ جب کسی نے یوں غریبوں کے خون سے ہولی کھیلی نہ تھی۔ جب کسی نے یوں اپنی گلیوں اور بازاروں میں نہتی عورتوں اور بچوں پر حملہ نہ کیا تھا۔ ابھی وہ چنگاری نفرت کی چتا نہ بنی تھی۔ جس نے ہمارے پانچ ہزار سال پُرانے تہذیب و تمدّن کو یوں راکھ بنا ڈالا۔ خیر جو کچھ ہوا سو ہوا۔ نتیجہ آپ کے سامنے ہے نتیجہ میرے سامنے ہے کوئی کہتا ہے یہ کانگریس کی فتح ہے کوئی کہتا ہے یہ مسلم لیگ کی فتح ہے..... میرے خیال میں یہ دونوں کی شکست ہے۔

کرشن چندر نے سیاستِ حاضرہ کا نہایت باریک بینی سے تجزیہ کرتے ہوئے کہا۔ کہ اگر یہ سیاسی تجزیہ ہی درست ہو تو اس صورت میں کیا آپ کا اور ہمارا یہ فرض نہیں کہ ہم دشمن کی تجویز کو کبھی کامیاب نہ ہونے دیں۔ ہندستان میں اور پاکستان میں سامراج دشمن طاقتوں کو مضبوط کرنے میں اپنا پورا پورا زور لگا دیں۔ اس طرح کہ ہندستان اور پاکستان میں سچے معنوں میں عوام کی حکومت قائم ہو سکے دونوں ملک آزاد رہ کر طاقتور رہ کر ایک دوسرے کے ساتھی بن کر ایشیائی آزادی اور پھر دنیا کی آزادی میں برابر کے حصّہ دار بن سکیں۔ تاریخ اس وقت یہ نہیں چاہتی کہ ایشیا کے ملک ایک دوسرے کے خلاف جنگ کریں وہ اس وقت یہ چاہتی ہے کہ غیروں کا اقتدار ختم ہو جائے۔ عوام کو امن و چین مل جائے اور وہ ایک دوسرے کی مدد کرتے ہوئے ترقی کے لیے آگے قدم بڑھائیں۔ جو ادیب اس وقت ان ترقی پسند خیالات کی اشاعت کرے گا اور اپنی تخلیقی قوتوں کو تاریخ کی مد میں صرف کرے گا اور وقت کے اس اہم تقاضے کو عوام کے دلوں تک لے جائے گا۔ وہی اپنے فرض سے عہدہ برآ ہو سکے گا جو ادیب اس وقت مذہبی منافرت پھیلائے گا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں سول راج کی تلقین کرے گا۔ اپنی ادبی صلاحیتوں کو خانہ جنگی کے لیے استعمال کرے گا۔ وہ نہ ہندوؤں کا ساتھی ہے اور نہ مسلمانوں کا ساتھی ہے۔ وہ ہندستان کا دشمن ہے وہ پاکستان کا دشمن ہے۔ وہ پورے ایشیا کی آزادی کا دشمن ہے۔

آگے چل کر کرشن چندر نے کہا کہ مجھے خوشی ہے کہ آج کی کانفرنس احمد آباد میں ہو رہی ہے۔ ترقی پسند ادیبوں کو اپنی کانفرنس کسی صنعتی شہر میں کرنا چاہیے جیسا کہ احمد آباد ہے یا پھر کسی گاؤں میں، اگر واقعی ہمیں اپنے دیس کے رہنے والوں کی تمدنی زندگی نمائندے بننا ہے تو پھر یہ کہیں بہتر ہوگا کہ ترقی پسند مصنفین کے آئندہ اجلاس مزدوروں کی چالوں میں یا کسانوں کے جھونپڑوں کے آس پاس ہوا کریں۔ آگے چل کر کرشن چندر نے کہا کہ اگر کسی انجمن نے اردو میں کوئی ٹھوس کام کیا ہے تو وہ ترقی پسند مصنفین کی جماعت ہے یہ کوئی تعلی نہیں ٹھوس اور جامع حقیقت ہے۔ اردو زبان کی گذشتہ دس سالہ زندگی اس کی گواہ ہے۔ جوش اور فراق، مجاز اور ساغر، سردار اور کیفی راشد اور فیض ندیم اور ساحر۔ بیدی اور عصمت، منٹو، اور اشک، عباس اور فیضی سجاد اور احتشام وقار اور عبادت گنے جایئے پُرشکوہ اور پُرعظمت ناموں کا ایک سلسلہ ہے جو ختم ہونے میں نہیں آتا۔ ان میں لہلہاتے ہوئے درخت ہیں۔ نازک اور بانکے پودے ہیں اور رنگا رنگ پھلواریاں کہیں کوئی خاردار جھاڑی بھی نظر آجاتی ہے خیر یہ تو ہر چمن کا خاصہ ہے۔ اس باغ کی آبیاری میں اس کی حفاظت کے لیے اس کی ترقی کے لیے ہمیشہ ہمیشہ آپ کے تعاون کی ضرورت محسوس ہوتی رہے گی...... جب کرشن چندر نے اپنا خطبۂ صدارت ختم کیا تو حاضرین نے بہت زور و شور سے تالیاں بجائیں تمام ہال تحسین و آفرین کے نعروں سے گونج اٹھا......

پروگرام کے مطابق وارث حسین علوی نے استقبالیہ تقریر کی اُنھوں نے اپنی تقریر میں مختصر طور پر ترقی پسند تحریک پر روشنی ڈالی اور بتایا کہ احمد آباد میں یہ کس طرح نشو و نما پا رہی ہے۔ کانفرنس کا ذکر کرتے ہوئے اُنھوں نے کہا کہ یہ کانفرنس نہ صرف احمد آباد میں بلکہ بمبئی شہر سے مستثنیٰ تمام گجرات اور کاٹھیاواڑ میں اپنی قسم کی پہلی کانفرنس ہے۔ آگے چل کر اُنھوں نے اُن مرحلوں اور مشکلوں کا ذکر کیا جو کانفرنس کے سلسلے میں پیش آئی تھیں۔ اُنھوں نے کہا کہ ہماری شاہراہِ ترقی کا سب سے بڑا روڑا رجعت پسندوں کی وہ مخالفانہ روش تھی جس کے ذریعے وہ ہماری کانفرنس کو ناکامیاب بنانا چاہتے تھے اور ردِعمل کے طور پر ہماری تحریک اور ہماری انجمن کو مٹا کر خود کو طاقتور بنانا چاہتے تھے۔ چنانچہ یہاں کے رجعت پسند بزرگوں سرمایا داروں اور

لیڈروں نے سیاست اور مذہب کو اپنا آلہ کار بنایا اور جاہل عوام کے جذبات سے کھیل کر انھیں ہمارے خلاف بھڑکایا لوگوں میں ہمارے خلاف غلط پروپگنڈہ کر کے ہم پر جھوٹے الزام لگا کر انھیں عجیب و غریب قسم کی غلط فہمیوں میں مبتلا کر دیا۔ مختصر یہ کہ ہماری کانفرنس کو ناکام بنانے کے لیے نہایت اوچھے ہتھیاروں کا استعمال کیا۔ نتیجہ...... نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔ نتیجہ اُن سینکڑوں لوگوں کے سامنے ہے جو اس وقت ہال میں بیٹھے ہیں۔ نتیجہ اُن ہزاروں لوگوں کے سامنے ہے جو ٹکٹ نہ ملنے کی وجہ سے ہال کے باہر کھڑے ہیں۔ آخر میں اُنھوں نے کہا کہ ہماری شاہ راہِ ترقی کھلی پڑی ہے اور ہم ترقی کو پسند بھی کرتے ہیں کیونکہ ہم ترقی پسند ہیں ہم اس شاہ راہِ ترقی پر بڑھتے ہی چلے جائیں گے اس وقت تک جب تک ہم ہماری منزل کو نہ پالیں رجعت پسندوں کی یہ فسطائیت اور امن مخالفتیں ہماری جد و جہد کو کسی صورت نہ روک سکیں گی...... وارث حسین علوی کے خطبۂ استقبالیہ کے بعد کیفی اعظمی کا نام پکارا گیا۔ جب وہ آلۂ مکبرۃ الصوت کے قریب آئے تو حاضرین نے اُن سے اپنا تعارف کرانے کے لیے کہا۔ کیفی نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ میرا تخلص کیفی ہے۔ اعظم گڑھ میرا وطن اور ان دونوں کی رعایت سے کیفی اعظمی کہلاتا ہوں۔ اس کے بعد کیفی نے ایک نظم سُنائی جس کا عنوان تھا "سوداگر" نظم کے ایک ایک بند پر پورا ہال تالیوں سے گونج اُٹھتا تھا۔ بہرحال کیفی کی نظم بہت پسند کی گئی۔ اور حاضرین نے جی کھول کر داد دی۔

کیفی کے بعد سردار جعفری نے تقریر کی تقریر نہایت دلچسپ ٹھوس اور رواں دواں تھی اور تنوع کا یہ عالم تھا کہ لوگ ہمہ تن گوش بنے بیٹھے تھے۔ اُن کے چہرے بشرے سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ اگر سردار ساری رات تقریر کرتا رہے تو وہ بیٹھے سُنتے رہیں گے۔

سردار جعفری نے اپنی تقریر میں سیاست حاضرہ کے پس منظر میں ترقی پسند تحریک پر نہایت مدلّل اور جامع طریقہ پر بحث کی تقریر کی ابتدا کرتے ہوئے اُنھوں نے کہا کہ آج ہماری کانفرنس اس جگہ ہو رہی ہے جہاں اردو کا پہلا شاعر ولی سویا ہوا ہے اُنھوں نے ملک کی سیاست کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اس وقت ملک ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا ہے۔ ہندستان کی دیسی ریاستیں خود مختاری کا اعلان کر رہی ہیں یہی

نہیں بلکہ یہ بھی کوشش کی جارہی ہے کہ آرٹ ۔ ادب اور کلچر کے بھی ٹکڑے کردیے جائیں لیکن احمد آباد آگرہ اور دہلی کے مندر اور مسجدیں بھی اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ کبھی آرٹ اور کلچر کے ٹکڑے نہیں ہو سکتے۔ اُنھوں نے بتایا کہ ترقی پسند مصنفین ہی صرف ایک ایسی جماعت ہے جہاں مختلف خیالات رکھنے والے لوگ ایک مرکز اور ایک مرکز پر آکر متحد ہو گئے ہیں اور اس مرکز سے اخوت و اتحاد کا پیغام دیتے ہیں اور اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ ادب اور آرٹ کے ٹکڑے نہ ہونے پائیں ۔ بلکہ ہماری تمام تر تخلیقات متفقہ کوششوں کا نتیجہ ہوں ۔ کیوں کہ یہی ادب کا اتحاد مستقبل میں اس ملک کے دو ٹکڑوں کے اتحاد کا باعث ہوگا ۔ تقریر ختم کرکے سردار جعفری تالیوں کی گونج میں اپنی جگہ بیٹھ گئے اور اُن کے بعد چند مقامی شعراء نے اپنا کلام سُنایا ۔ جن میں اشرف اور وحید بنارسی کی نظمیں بہت پسند کی گئیں ۔ اس کے بعد مجروح سلطانپوری نے ایک غزل بہت خوبصورت ترنم کے ساتھ سُنائی غزل کا ہر شعر سامعین سے داد وصول کر رہا تھا ۔ خوبصورت اور معیاری غزل پڑھنے کے بعد مجروح صاحب داد اور تحسین کے شور میں اپنی جگہ آکر بیٹھ گئے ۔ مجروح سلطانپوری کے بعد ساحر لدھیانوی نے ایک نظم بعنوان "آج کل" سُنائی یہ نظم بھی بے حد پسند کی گئی ۔ ساحر کے بعد نیاز حیدر نے نظم پڑھی اور یہ نظم بھی بہت کامیاب رہی ۔ بعد ازاں سردار جعفری سے نظم سُنانے کو کہا گیا جب سردار جعفری مائکروفون پر آئے تو تمام ہال تالیوں سے گونج اُٹھا ۔ نظم سنانے سے پیشتر سردار جعفری نے کہا کہ یہ ایک ڈرامائی نظم ہے اور بہت طویل ہے ۔ اس لیے اس وقت میں اس کا ایک ہی حصہ پڑھوں گا ۔ لیکن سامعین نے پُر زور طریقہ پر اصرار کیا کہ پوری نظم سُنائی جائے ۔ اس پر سردار جعفری نے کہا کہ یہ نظم دو ہزار اشعار پر مشتمل ہے ۔ اتنا کہنے پر تمام ہال قہقہوں سے گونج اُٹھا اور پھر کسی نے مزید اصرار نہیں کیا نظم سُنانے سے پہلے سردار جعفری نے نظم کے متعلق ضروری ہدایات و تفصیلات بتا دیں تاکہ نظم کو سمجھنے میں زیادہ آسانی ہو اور جب سردار نے نظم سُنانی شروع کی تو ہال میں سناٹا چھا گیا ۔ سامعین نے نہایت غور و خاموشی سے سُنی ۔ نظم کا عنوان تھا ۔ "نئی دنیا کو سلام" غالباً یہ پہلی نظم معرّا تھی جو اس پلیٹ فارم پر پڑھی گئی ۔ سردار جعفری کے بعد کیفی نے اپنی مشہور نظم "تلوار" سُنائی ۔ اس کے بعد ساحر نے اپنی شاہکار نظم

"تاج محل" سُنائی ۔ مجروح اور کیفی کو بار بار پڑھانے کے باوجود سامعین مطمئن نہ ہوئے اور ان دونوں کو سننے کے لیے بار بار فرمائش کرتے رہے ۔ تقریباً ساڑھے بارہ بجے کرشن چندر نے اعلان کیا کہ اب حضرت جوش ملیح آبادی آپ کو اپنا کلام سُنائیں گے ۔ جوش کا نام سُنتے ہی تمام ہال خوشی کے نعروں سے گونج اُٹھا ۔ پہلے تو اُنھوں نے سنبل و سلاسل میں سے بہت سی رباعیاں پڑھ کر سُنائیں اس کے بعد ایک نظم بعنوان "زندانی" پڑھی ۔ نظم کے ایک ایک شعر پر تمام ہال تحسین و آفریں کے نعروں سے گونج اُٹھتا تھا ۔ اس کے بعد دوسرے دن کے لیے جلسہ برخاست کر دیا گیا ۔

دوسرا اجلاس

کانفرنس کا دوسرا اجلاس ۶ ؍ جولائی ۱۹۴۷ء اتوار کی شب کو دس بجے شروع ہوا ۔ اس جلسے کی صدارت سید سجاد ظہیر نے کی ۔ اُنھوں نے اپنی صدارتی تقریر میں ترقی پسند ادب پر روشنی ڈالی ۔ اُنھوں نے کہا کہ ترقی پسندی کا کیا مطلب ہے اور یہ اجاب پر کس حد تک اثر انداز ہوئی ۔ اُنھوں نے کہا ترقی پسند تحریک کو شروع ہوئے اس وقت تک گیارہ سال کا عرصہ گذر چکا ہے ۔ اس مختصر سے عرصے میں اس نے اردو کے عموماً تمام اچھے لکھنے والوں کو متاثر کیا ہے ۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ ترقی پسندی صرف ہم ہی تک محدود ہے ۔ بلکہ ہمارا تو یہ کہنا ہے کہ اپنے وقت کا بہترین ادب ترقی پسند ادب ہوتا ہے اُنھوں نے کہا کہ ہمیں ماضی میں بھی ترقی پسند عناصر نظر آتے ہیں ۔ مثال کے طور پر نظیر اکبرآبادی ترقی پسند شاعر تھا ۔ کیوں کہ اُس نے اپنے شعروں کے لیے ان موضوعات کا انتخاب کیا جو عوام سے متعلق تھے ۔ ہم ماضی سے متنفر نہیں بلکہ ماضی کی ان روایات سے نفرت کرتے ہیں جو ہماری ادبی ، سماجی ، سیاسی اور معاشی ترقی کے راستے میں سنگِ راہ بنی ہوئی ہیں ۔ ترقی پسند مصنفین کی انجمن کا ذکر کرتے ہوئے اُنھوں نے کہا کہ ہماری انجمن ہی صرف ایسی انجمن ہے جہاں متفرق الخیال لوگ ایک نکتہ پر آکر ہم خیال ہو گئے ہیں اور اس نکتہ اور مرکز کے ذریعے وہ اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ عوام کی زندگی کے معیار کو بڑھایا جائے ۔ اقتصادی ، سماجی ، سیاسی ، بدحالیوں کو دُور کیا

جائے۔ اور لوگوں میں صحیح و صحت مند ذوق پیدا کیا جائے۔ آگے چل کر اُنھوں نے کہا کہ یہ اعتراض بالکل غلط ہے کہ ہماری انجمن پر کمیونسٹوں کا غلبہ ہے۔ اُنھوں نے کہا کہ ہماری انجمن میں ہر قسم کے سیاسی خیالات رکھنے والے لوگ موجود ہیں۔ ہماری انجمن میں قاضی عبدالغفار اور خواجہ احمد عباس بھی ہیں جو نیشنلسٹ ہیں۔ احمد ندیم قاسمی فیض احمد فیض اور حفیظ جالندھری جیسے حضرات بھی ہیں جو خیالات کے لحاظ سے مسلم لیگی ہیں۔ اس میں کمیونسٹ بھی ہیں جیسے سردار جعفری اور میں ...... اور مجھے اس بات پر فخر ہے کہ میں کمیونسٹ ہوں۔ اپنی تقریر کے آخر میں اُنھوں نے کہا کہ ہمیں اس کا اعتراف ہے کہ ہم میں چند خامیاں بھی ہیں اور ہم چاہتے ہیں کہ ہماری ان خامیوں کو رفیقانہ طور پر دور کرنے کی کوشش کی جائے اور اس کام کو صرف معیاری تنقید پورا کر سکتی ہے۔ وہ تنقید جس میں بغض و حسد کے بجائے خلوص و محبت ہو۔ سجاد ظہیر نے کل کے جلسے کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ عموماً بہت سے لوگوں کو یہ شکایت رہ گئی کہ کل کا اجلاس بہت جلد ختم کر دیا گیا۔ اس شکایت کی تلافی ہم آج کے اجلاس میں کریں گے۔ چاہے آپ سُنتے سُنتے تھک جائیں ہم سناتے سناتے نہیں تھکینگے۔ اس پر تمام ہال تالیوں اور قہقہوں سے گونج اُٹھا اور سجاد ظہیر نے کہا کہ آج سب سے پہلے جوش ملیح آبادی آپ کو اپنا کلام سُنائیں گے۔ اتنا سُننے پر حاضرین نے زور و شور سے تالیاں بجائیں۔ سجاد ظہیر نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ حالانکہ رسم کے مطابق جوش صاحب جیسے قادر الکلام اُستادوں کو مشاعرے کے آخر میں پڑھنا چاہیے۔ لیکن ایسی رسوم سے چپکے رہنا بالکل عبث ہے جن سے کوئی خاص فائدہ نہ ہوتا ہو۔ اس کے بعد جوش ملیح آبادی نے اپنا کلام سُنایا پہلے بہت سی رُباعیاں اور قطعات پڑھے اور پھر ایک نظم جس کا عنوان تھا۔ "غارتگری" پڑھی۔ سامعین کا یہ حال تھا کہ ہر رباعی اور ہر قطعہ اور ہر شعر کو بار بار پڑھواتے تھے لیکن پھر بھی سیر نہ ہوتے تھے۔ ہر شعر پر ہال تحسین و آفریں کے نعروں سے گونج اُٹھتا تھا۔

جوش صاحب کے بعد سردار جعفری نے اقبال پر تقریر کی تقریر شروع کرتے ہوئے جعفری نے کہا کہ قبلہ جوش صاحب کے بعد ہم میں سے کسی کی اتنی جراُت نہیں کہ وہ اپنا کلام سُنا سکے۔ اس لیے ہم میں اور جوش صاحب میں کچھ فاصلہ رہنا ضروری ہے تاکہ یہ بُعد اور فاصلہ ہماری نظموں کے اثر کو زائل ہونے سے بچائے اور یوں بھی یہ مشاعرہ نہیں

بلکہ کانفرنس ہے اور اس مشاعرے کے علاوہ مناظرے کا ہونا بھی لازمی ہے۔ اپنی تقریر کو جاری رکھتے ہوئے سردار جعفری نے کہا کہ اس وقت میں ایک بہت بڑے شاعر کو عقیدت پیش کرنے کے لیے کھڑا ہوا ہوں۔ اقبال اور ٹیگور ایسے تھے جنھوں نے آزادی کے ترانے گائے اور لوگوں کو بیداری کا سبق دیا۔ ٹیگور کی کتابوں کے غیر زبانوں میں بہت سے ترجمے ہوئے اس لیے لوگوں کو ٹیگور کو سمجھنے کا بہت اچھا موقع ملا۔ لیکن یہ ہماری کمزوری ہے کہ ہم نے اقبال کو دوسری زبانوں میں ترجمہ نہیں کیا اور یہی وجہ ہے کہ لوگ اقبال کو جس طرح چاہتے ہیں سمجھ لیتے ہیں۔ اقبال کی شاعری کے بہت سے ٹکڑے کیے جا سکتے ہیں اس کی شاعری میں نیشنلزم بھی ہے اور کمیونزم بھی اس میں تحریک آزادی بھی ہے اور تبلیغ اسلام بھی لیکن ان تمام چیزوں کے ہونے کے باوجود اقبال کسی ایک جماعت کا شاعر نہیں کہا جا سکتا۔ اقبال مسلمانوں کا شاعر نہیں بلکہ انسانیت کا شاعر ہے۔ اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے سردار جعفری نے کہا کہ میں کمیونسٹ ہوں۔ لیکن میں یہ ثابت کرنا نہیں چاہتا کہ اقبال کمیونسٹ تھے لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ اقبال پہلا شاعر تھا جس نے مزدوروں اور کسانوں اور غریبوں کو بیدار کرنے کے گیت گائے۔ جس نے انقلاب کا پیغام اور جمہوریت کا نغمہ سُنایا۔ اقبال کی شاعری ایسے دور میں آئی۔ جبکہ ہندستان تین سو سال کی غفلت کے بعد اُٹھا تھا۔ اس لیے اقبال کی شاعری میں ہمیں بیداری نظر آتی ہے۔ اپنی تقریر کو جاری رکھتے ہوئے سردار جعفری نے کہا کہ اقبال سے پہلے بھی بہت بڑے بڑے شاعر ہوئے ہیں۔ لیکن اُنھوں نے ہمیشہ اپنی نظموں کے ذریعہ گریز اور فراریت کی تبلیغ کی اُنھوں نے ہندوں اور مسلمانوں کے اُس فلسفے کی تبلیغ کی جو خودکشی کا فلسفہ تھا جو غریبوں کو غریب بنانے کا فلسفہ تھا۔ جو سکھاتا تھا کہ یہ دنیا مایا جال ہے۔ یہ سب دھوکہ ہے فریب ہے۔ اقبال نے اسی فلسفے کے خلاف ضربیں لگائیں۔ اُس نے کہا کہ یہ دُنیا مایا جال نہیں، یہ آسمان یہ زمین، یہ سبزہ زار یہ آبشار، یہ سب فطرت کی نیرنگیاں ہیں فطرت کی رعنائیاں ہیں مایا جال نہیں فریب نہیں دھوکہ نہیں بلکہ حقیقت ہیں۔ جعفری تقریر کر ہی رہے تھے کہ حاضرین میں سے ایک صاحب جلال میں اُٹھ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے کہ آپ اقبال کے صرف ایک ہی رُخ کو پیش کر رہے ہیں۔ اس کے بعد اُنھوں نے اقبال کے دوسرے رُخ کے اشعار پیش کرنا شروع کیے اس پر جعفری نے کہا کہ آپ تشریف رکھیے، میں یہ سب کچھ جانتا ہوں اُس کے بعد جعفری نے وہ تمام اشعار پڑھنا شروع کیے

جن کے پڑھنے کا ارادہ غالباً ان صاحب کا تھا۔ پھر جعفری نے ان اشعار کی تفصیل اور اس کی گہرائی میں چھپے ہوئے معنی کو نہایت ہی سلجھے ہوئے انداز میں بیان کرنا شروع کیا۔ سامعین کا یہ حال تھا کہ جعفری کے ایک ایک جملے پر نہایت زور شور سے تالیاں بجاتے تھے اور تمام ہال تحسین و آفرین کے نعروں سے گونج اٹھتا تھا۔ جب جعفری نے تقریر ختم کی تو لوگوں نے بہت زور زور سے تالیاں بجائیں۔

سردار جعفری کی تقریر کے بعد چند مقامی شاعروں نے اپنا کلام سنایا۔ سب سے پہلے اشرف نے ایک نظم سنائی جو بہت پسند کی گئی۔ اس کے بعد زوار حسین احمر نے ایک نظم بعنوان "شاعر اور برسات" سنائی۔ احمر صاحب کے بعد مستم مبارکپوری نے ایک نظم سنائی جس کا عنوان تھا "شاعر نو"۔ وحید بنارسی نے اپنی نظم "میری شاعری" بہت ہی عمدہ ترنم کے ساتھ پڑھی۔ مائل بھوپالی کی نظم وادیٔ کشمیر بھی بہت پسند کی گئی۔ ان حضرات کے علاوہ کامل اور سمیع نے بھی اپنا کلام سنایا۔

مقامی شعرا کے بعد کیفی اعظمی نے اپنی مشہور نظم "تاج" سنائی۔ جو بیحد پسند کی گئی۔ کیفی کے بعد نیاز حیدر نے نظم پڑھی۔ اس کے بعد مجاز لکھنوی نے بہت ہی خوبصورت ترنم کے ساتھ غزل پیش کی۔ غزل سن کر تمام حاضرین جھوم اٹھے۔ اس کے بعد سردار جعفری نے اپنی طویل نظم "جمود" پڑھی۔ سردار کے بعد مجروح سلطانپوری نے نہایت ہی شیریں ترنم کے ساتھ غزل پیش کی۔ بعد ازاں ساحر لدھیانوی نے ایک نظم پڑھی جو بہت پسند کی گئی۔ ساحر کے بعد پھر مجاز نے اپنی نظم "نورا" پڑھی۔ کیفی نے ایک انقلابی نظم پڑھی جو بہت پسند کی گئی۔ جب کیفی اپنی نظم سنا چکے تو پھر مجروح نے اپنی غزل سنانی شروع کی۔ مجروح صاحب غزل سنا ہی رہے تھے کہ پھر وہی صاحب جنھوں نے سردار جعفری کی تقریر کے دوران ہنگامہ کیا تھا کھڑے ہو گئے اور چیخنے لگے کہ ہمیں بھی کچھ بولنے دیا جائے لیکن تمام حاضرین نے بیٹھ جاؤ بیٹھ جاؤ کے نعرے لگانے شروع کر دیے اور ایک ہنگامہ مچ گیا۔ اس کے بعد سجاد ظہیر نے کھڑے ہو کر کہا کہ وحشی صاحب کو سردار جعفری کی تقریر سے اختلاف ہے اور اس کے متعلق وہ کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ اس سلسلے میں۔ میں حاضرین سے ووٹ لینا زیادہ بہتر سمجھتا ہوں۔ اس لیے وہ حضرات جو یہ چاہتے ہوں کہ وحشی صاحب کو بولنے کی اجازت دی جائے اپنے ہاتھ اٹھائیں۔ جو ہاتھ اٹھے ان کی تعداد بہت ہی کم تھی۔ اس کے بعد سجاد ظہیر

نے کہا کہ اب وہ لوگ ہاتھ اٹھائیں جو یہ چاہتے ہیں کہ وحشی صاحب کو بولنے کی اجازت نہ دی جائے۔ عام رائے وحشی صاحب کے خلاف تھی۔ لیکن وہ بدستور شور مچاتے رہے آخر کار سجاد ظہیر نے نہایت ہی خلوص کا اظہار کرتے ہوئے۔ وحشی صاحب کو بولنے کی اجازت دے دی۔ وحشی صاحب جب اسٹیج پر آئے تو حاضرین نے بہت ہا ہو کی اور خوب شور غل مچایا لعنت ہے لعنت ہے کے شور و غل سے تمام ہال گونج اٹھا ...... وحشی صاحب نے بولنا شروع کیا ...... آپ یہ تو جانتے ہی ہیں کہ یہ مشاعرہ یا کانفرنس کیا ہے اور وہ اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ کالی شیروانی میں ملبوس ایک طالب علم چلّائے۔ کیا یہ آپ اقبال پر بول رہے ہیں۔ اور پھر ہال میں ایک ہنگامہ شروع ہو گیا۔ اس کے بعد وحشی صاحب نے اقبال پر تقریر کرنا شروع کی لیکن حاضرین نے بجائے وحشی کی تقریر سننے کے ان پر پھبتیاں کسیں اسٹیج پر پیسے پھینکے اور زور زور سے آوازے کسنے لگے کہ لائیے حضرت آپ کون سی دوائی فروخت کرتے ہیں۔ آخر کار جب وحشی صاحب اپنی تقریر ختم کر چکے تو حاضرین نے خوب تالیاں بجائیں اور تمام ہال طنز کے قہقہوں سے گونج اٹھا۔ اس کے بعد کیفی نے ایک نظم سنائی۔ اس طرح پھر ساحر، سردار، نیاز، مجاز، مجروح یکے بعد دیگرے اپنا کلام سناتے رہے۔ اور رات کے تین بجے کے قریب کانفرنس کا یہ دوسرا اور آخری اجلاس برخاست کر دیا گیا۔

نوٹ: یہ کانفرنس ہندستان کی آزادی سے ڈیڑھ ماہ قبل جولائی ۱۹۴۷ء پریما سبھائی ہال احمدآباد میں منعقد ہوئی تھی۔

یادگار اردو کانفرنس

۱۹۵۲ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی جانب سے نیز دیگر انجمنوں کے تعاون سے احمد آباد میں دو روزہ اردو کانفرنس اور مشاعرہ کا انعقاد ہوا۔ یہ کانفرنس احمد آباد کی یادگار اردو کانفرنس ثابت ہوئی۔ اس کانفرنس اور مشاعرے میں جن ادیب و شعرا نے شرکت کی ان میں کچھ نام اس طرح ہیں۔ احتشام حسین، نجیب اشرف ندوی، شہاب الدین دسنوی، سردار جعفری، مجروح سلطان پوری، کیفی اعظمی، اعجاز صدیقی، مظفر شاہجہانپوری، ظفر گورکھپوری، خلیق برہانپوری، ان کے علاوہ بھی دیگر شعرا نے حصہ لیا۔ کانفرنس کے پنڈال کے پانچ دروازے بنائے گئے تھے۔ سب سے بڑا گیٹ ولی احمد آبادی کے نام سے ولی گیٹ منسوب کیا گیا تھا۔ اوپر بڑی تصویر ولی احمد آبادی کی آویزاں تھی داہنی بائیں طرف میر تقی میر گیٹ، غالب گیٹ، اقبال گیٹ، حسرت موہانی گیٹ بنائے گئے تھے۔ اور ان سب پر ان شعرا کی تصویریں بھی آویزاں تھیں۔ والنٹیر بیج کے علاوہ دس ہزار بیج بنائے گئے تھے۔ ایک بیج کی قیمت ایک روپیہ تھی۔ بس یہی مشاعرے اور کانفرنس کا داخلہ پاس تھا۔ دس ہزار اردو کے دیوانے دو روز تک شہر میں کانفرنس کے بیج لگائے گھومتے رہے۔ ہدایت کر دی گئی تھی کہ سب لوگ دو روز تک اپنا بیج لگائے رہیں۔

عجیب منظر تھا۔ شہر میں جس طرف بھی نظر اٹھا اردو کے شیدائی کانفرنس کا بیج لگائے گھومتے ہوئے نظر آنے لگے۔ کانفرنس کے پہلے دو سیشن پریما بھائی ہال میں ہوئے جس میں سینکڑوں لوگوں نے شرکت کی۔ آخر کھلا اجلاس سمنٹ کی چال میں ہوا۔ جہاں بہت بڑا پنڈال بنا ہوا تھا۔ جہاں پر دس ہزار سے

زیادہ لوگوں کے بیٹھنے کا انتظام تھا۔ اجلاس کی صدارت احتشام حسین نے کی تھی۔ رات کو دو بجے تک کثیر تعداد میں لوگ نہایت سکون و اطمینان کے ساتھ مقالات سنتے رہے تمام مہمانوں کے ٹھہرنے کا انتظام احمد آباد شہر سے دس کلومیٹر دور واقع سرخیز روڈ ایک بہت خوبصورت بنگلہ میں کیا گیا تھا۔ مہمانوں کو لانے لے جانے کے لیے گاڑیوں کا انتظام کیا گیا تھا۔

صرف احتشام حسین شہر میں انوار احمد سریس والا کے مکان پر قیام پذیر تھے۔ ۱۹۵۲ء میں سرخیز میں آج کی طرح بستی نہیں تھی۔ جنگل ہی جنگل تھا۔ کہیں ایک آدھ بنگلہ نظر آجاتا تھا اور وہ بھی خالی ہی پڑا رہتا تھا۔ آج تو سرخیز احمد آباد کا ایک دوسرا شہر بن گیا ہے۔ مہمانوں کے قیام کے علاوہ طعام کا انتظام بھی وہیں کیا گیا تھا۔ آخری وقت بڑی مشکل آکھڑی ہوئی۔ بنگلے کے جمعدار نے بتایا کہ یہاں پر رات کو خطرہ ہے آپ کے مہمانوں کا تمام سامان یہاں پر ہے۔ اور رات کو میں اور باورچی صرف دو ہی آدمی رہیں گے۔ اس لیے آپ اپنے دو تین آدمی یہیں پر رکھیں واقعی اس کی بات معقول تھی۔

اس زمانے میں اس علاقے میں رات کو اکثر چوری کی وارداتیں ہو جاتی تھیں۔ اب ایسے عالم میں کون انجمن کا آدمی قربانی دے۔ مشاعرہ اور کانفرنس چھوڑ کر دو روز تک کون وہاں پہرہ دے لوگوں سے پوچھا گیا۔ سب لوگ دو ماہ سے کانفرنس اور اور مشاعرے کا انتظار کر رہے تھے۔ اس کو کامیاب بنانے کے لیے دوڑ دھوپ کر رہے تھے اور اب آخر وقت میں اتنی خوبصورت کانفرنس اور مشاعرہ چھوڑنے کو کوئی بھی تیار نہیں تھا۔ آخر کار انجمن کے ایک مخلص کارکن امان اللہ خاں اور ان کے ساتھ دو دوسرے حضرات نے خود کو پیش کیا، ان لوگوں کی قربانی آج بھی یاد آتی ہے۔ ان لوگوں کے سامنے صرف ایک ہی سوال تھا۔ انجمن کا پروگرام کیسے کامیاب ہو۔ مشاعرہ اور کانفرنس بہت کامیاب رہی۔ کافی دن تک اخبارات میں چرچا ہوا۔ اعجاز صدیقی نے رسالہ "شاعر" میں اس کانفرنس کا خصوصی ذکر کیا۔ جن لوگوں نے اس کانفرنس میں دوڑ دھوپ کی۔ ان میں تبسم مبارک پوری۔ راز صدیقی، وحید بھوپالی، اشعر نوری، قمر نوری، احسان جعفری اسماعیل خالصدی، محترمی زخمی دہلوی، جمال الدین قادری، جاوید انصاری، انوار احمد

رئیس والا۔ کامل جونپوری اور راقم الحروف

کانفرنس کے تمام اخراجات نکال کر پانچ سو روپے انجمن کے پاس بچا تھا۔ مشاعرہ کمیٹی نے متفقہ طور پر طے کیا کہ اس روپے سے مجاز لائبریری قائم کی جائے۔ چنانچہ پانچ سو روپے دے کر جگہ حاصل کی گئی۔ کتابوں کا انتظام اعزازی طور پر کیا گیا۔ اور کافی کتابیں اکٹھا ہو گئیں۔ جب تک زوار حسین احمد آباد میں رہے۔ مل کی نوکری کے بعد لائبریری کا کام سنبھالتے رہے۔ اور بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ لائبریری چلتی رہی اُن کے وطن چلے جانے کے بعد لائبریری کو کوئی معقول آدمی نہیں ملا۔ جو ان کی طرح لگن اور محنت سے کام کرتا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کی اردو کانفرنس کی یادگار مجاز لائبریری حالات زمانہ کی شکار ہو گئی۔ اور انجمن نے کچھ شعرا اور ادیب ایسے ضرور دیے جو آگے چل کر ہندستان گیر شہرت کے مالک ہوئے۔ جن میں وارث حسین علوی، محمد علوی، مظہر الحق علوی، رحمت امروہوی قابل ذکر ہیں۔

احمد آباد کے مشاعرے

۱۹۴۷ء سے قبل پورے ہندستان میں مشاعرے آج کے مشاعروں سے بالکل مختلف تھے اچھے اُستاد اور معیاری کلام کہنے والے شعرا مشاعروں میں بُلائے جاتے تھے کیا پڑھتے تھے ترنم یا تحت اللفظ کے پیش نظر نہیں بلکہ کیا کہتے ہیں۔ شعرا کے ساتھ سودے بازی کبھی نہیں ہوتی تھی۔ سفر خرچ و قیام و طعام کے انتظامات بانیانِ مشاعرہ کو کرنے ہوتے تھے صاحبِ ذوق حضرات کثیر تعداد میں مشاعروں میں شرکت کرتے تھے داخلہ پاس یا ٹکٹ وغیرہ کا دستور نہ تھا۔ مشاعرے دیوان خانوں یا بڑے بڑی حویلیوں میں ہوتے تھے۔ کبھی کبھی کسی بڑے ہال میں بھی منعقد ہوتے تھے۔ . . . لمبی رات تک مشاعرے چلتے تھے۔ لوگ مشاعرہ ختم ہونے کے بعد ہی گھروں کو واپس لوٹتے تھے۔ شعرا حضرات درمیانِ مشاعرہ سے اُٹھ کر گھر چلے آنا معیوب سمجھتے تھے کہتے تھے کہ مشاعرہ کو پیٹھ نہیں دکھانی چاہیے۔

مشاعروں میں ریل کرائے کے علاوہ نذرانہ لینے کی ابتدا، غالباً جگر مرادآبادی سے ہوئی۔ جگر اُس زمانے کے سب سے مقبول شاعر تھے۔ جگر صاحب کی بادہ پرستی کے باوجود جگر صاحب کو بڑے بڑے باوقار اور پرہیزگار لوگ سر آنکھوں پر جگہ دیتے تھے۔ اور ان کی عزت کرتے تھے۔ یہی نہیں بلکہ اُن کے آرام و آسائش کا پورا پورا خیال رکھتے تھے جگر صاحب کو مہمان بنانے میں اپنی عزت محسوس کرتے تھے ۱۹۴۷ء سے قبل احمد آباد کے ایک مشاعرے میں جگر صاحب کو دعوت دی گئی۔ جگر صاحب نے جواب میں لکھا کہ میں ریل کرائے کے علاوہ سو روپے لوں گا اور آپ کے مشاعرے میں صرف ایک غزل پڑھوں گا۔ یہ نذرانہ ایک غزل پڑھنے کا ہے۔ یہ علیحدہ بات

ہے کہ میرا دل چاہے تو میں ایک سے زیادہ غزلیں پڑھوں اگر یہ شرط منظور ہو تو آپ مجھے لکھیں بانیانِ مشاعرہ نے جگرؔ صاحب کی شرط منظور کر لی۔ جگرؔ صاحب احمد آباد آئے اور چار روز رہے۔ ایک سے زائد غزلیں مشاعرے میں پڑھیں کئی نشستوں میں بھی شرکت کی مشاعرہ بہت کامیاب رہا یہ مشاعرہ شہر کے وسط میں واقع پریما بھائی ہال میں منعقد ہوا تھا۔ جگرؔ صاحب جس روز آنے والے تھے۔ ان کو لینے کے لیے کئی لوگ اسٹیشن گئے۔ گاڑی آچکی تھی یا تو لوگ جگرؔ صاحب کو پہچان نہیں پائے یا جگرؔ صاحب نظر نہیں آئے لوگ مایوس ہو کر واپس لوٹ آئے رات کو دس بجے تک اس بات پر تشویش ہوتی رہی۔ کچھ لوگوں نے رائے دی کہ اسٹیشن پھر جانا چاہیے۔ ممکن ہے جگرؔ صاحب اسٹیشن پر ہوں۔ چنانچہ پھر اسٹیشن جایا گیا۔ جگرؔ صاحب ویٹنگ روم میں بیٹھے تھے۔ لوگوں نے معذرت کی اور جگرؔ صاحب کو قیام گاہ پر لے آئے۔ جگرؔ صاحب احمد آباد کے ادبی ماحول سے بیحد خوش تھے۔ چار روز تک سننے سنانے کا سلسلہ چلتا رہا۔ تاش شطرنج سے جگرؔ صاحب کو بہت لگاؤ تھا۔ شاعری کے ساتھ ساتھ یہ مشغلہ بھی رہا۔ آخری روز جگرؔ صاحب احمد آباد شہر گھومنے نکلے تاریخی مقامات کے علاوہ سماجی اداروں میں بھی گئے۔ بیت المال اور یتیم خانے میں نذرانے کی رقم میں سے کافی حصہ دے دیا۔ اس کے بعد دوستوں نے کہا کہ جگرؔ صاحب احمد آباد سے کچھ کپڑا اپنے لیے خرید لیجیے، یہاں کا کپڑا اچھا ہوتا ہے۔ چنانچہ جگرؔ صاحب نے کپڑا خرید لیا اور نذرانے کی رقم سے کچھ زیادہ ہی خرچ ہو گیا۔ چلتے وقت کرائے کے پیسے بھی بانیانِ مشاعرہ کو دینے پڑے۔ اس وقت احمد آباد سے دہلی کا کرایہ دس روپیہ تھا۔ گونڈے کا کچھ زیادہ ہوگا۔ جگرؔ صاحب واپس گونڈا ہی گئے تھے۔ بہت دنوں تک اس مشاعرے کا اور جگرؔ صاحب کا چرچا احمد آباد میں رہا۔

غالباً ۱۹۵۵ء میں بیت المال احمد آباد کی سلور جوبلی منائی گئی اور ایک بڑا مشاعرہ منعقد کیا گیا۔ یہ مشاعرہ بھی احمد آباد کا یادگار مشاعرہ تھا۔ اس مشاعرے سے تقریباً بیس ہزار روپیہ بیت المال کے فنڈ میں جمع کیے گئے تھے۔ سیٹھ قمرالدین لوکھنڈوالا بیت المال کے صدر تھے۔ مولانا حبیب الرحمٰن غزنوی اور قمرالدین نے اس مشاعرے میں کافی دوڑ دھوپ کی۔ راقم الحروف بھی مشاعرہ کمیٹی کا ممبر تھا۔ جگن ناتھ آزادؔ

مولانا ماہرؔ القادری، روشؔ صدیقی، محشرؔ امروہوی، شہبازؔ امروہوی کے علاوہ اور بہت سے شعرا اس مشاعرے میں شریک تھے۔ یہ مشاعرہ سیٹھ منگل داس ٹاؤن ہال میں منعقد ہوا تھا۔

اس مشاعرے سے قبل پروگریسو یونین کی جانب سے عبدالکریم معرفتیا نے ایک انڈو پاک مشاعرہ منعقد کیا تھا جس میں پاکستان سے منظرؔ صدیقی، تقیلؔ شفائی، زہرہ نگاہ اور مولانا ماہرؔ القادری شریک تھے۔ ہندستان کے شعرا میں اعجازؔ صدیقی، معین احسن جذبیؔ، شفاؔ گوالیاری، ارشدؔ صدیقی، سیدہ سردار اخترؔ کے علاوہ اور بھی بہت سے شعرا نے شرکت کی تھی مشاعرے کے دوسرے دن گجرات کے گورنر جناب مہدی نواز جنگ نے گورنر ہاؤس میں تمام شعرا کو مدعو کیا اور کافی مدارات کی مہدی نواز جنگ ادبی آدمی تھے۔ ادیب و شعرا حضرات کو بہت قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ جب بھی اُن کا کوئی مہمان آتا گورنر ہاؤس میں مشاعرہ ہوتا۔ احمد آباد کے شعرا سے ملاقات کراتے۔ راقم الحروف کی ہر مشاعرہ میں شرکت رہی۔ شعرا کو ہر مرتبہ کچھ نہ کچھ تحفہ دیتے یہ ان کا دستور تھا۔ رخصت کرتے وقت پہلے خود دروازے پر آکر کھڑے ہو جاتے۔ ایک نوکر تشت میں تحفے لے کر کھڑا ہوتا۔ گورنر صاحب اپنے ہاتھ سے تقسیم کرتے۔ اُن کے دورانِ قیام میں حیدر آباد کے ادیب و شعرا اکثر آتے رہتے تھے۔ اور ہفتوں گورنر صاحب کے مہمان رہتے تھے۔ سلیمان اریب، سرور ڈنڈا، نصیرالدین ہاشمی، مخدوم محی الدین، عابد حسین، سکندر علی وجد سے ہم لوگوں کی ملاقات گورنر ہاؤس میں ہوئی۔ ایک مرتبہ راقم الحروف نے مہدی نواز جنگ سے کہا کہ ویسے تو ہم لوگ ہر دوسرے تیسرے مہینے یہاں آتے رہتے ہیں۔ لیکن کسی خاص ضرورت کے تحت آپ سے ملاقات کرنی ہو تو بہت دشواری ہوتی ہے۔ اُس وقت تو گورنر صاحب نے کوئی جواب نہیں دیا۔ دو ماہ کے بعد گورنر ہاؤس میں پھر نشست کا پروگرام تھا۔ اس مرتبہ رخصتی کے وقت آنے والے تمام شعرا کو شیروانی کا کپڑا اور حیدر آباد کی ٹکسال کی غالباً "اٹھنیاں" ہونگی چاندی کی جن کے پیچھے سنار سے چاندی کے ہک لگوا کر بٹن بنا لیا گیا تھا اور ایک ایک سیٹ کپڑے کے ساتھ دیا گیا۔ راقم الحروف کی جب باری آئی تو میری طرف دیکھ کر مسکرائے اور کہنے لگے کہ آپ یہ شیروانی پہن کر آئیں گے تو آپ کو کوئی نہیں روکے گا۔ مشاعرے آج

بھی احمد آباد میں ہوتے ہیں۔ بلکہ سال میں پانچ چھے بڑے مشاعرے ہوتے ہیں لیکن وہ پہلے جیسی بات نہیں ہر مشاعرے میں متشاعر شعرا کو اہمیت دی جاتی ہے اور اب تو شاعرہ شاعرات کی بدعت بھی چل پڑی ہے ڈھونڈ ڈھونڈ کر شاعرات کو بلایا جاتا ہے۔ ایسے مشاعرے سننے سے کم اور دیکھنے سے زیادہ تعلق رکھتے ہیں۔ عوام بھی کثیر تعداد میں شرکت کرتے ہیں۔ البتہ اب گجرات اردو بورڈ احمد آباد کی جانب سے صاف ستھرے مشاعرے منعقد ہونا شروع ہو گئے ہیں۔ سال میں ایک مشاعرہ گجرات اردو بورڈ منعقد کرتا ہے جس میں شہر کے تمام پڑھے لکھے لوگ شرکت کرتے ہیں۔ صرف یہی ایک مشاعرہ ایسا ہوتا ہے کہ جس میں ٹکٹ وغیرہ نہیں ہوتا ہے۔ مشاعرہ نہایت کامیاب ہوتا ہے احمد آباد کے تمام اخبارات اس کی رپورٹ دیتے ہیں۔ لوگوں میں کافی دنوں تک اس کا چرچا رہتا ہے۔ گجرات اردو بورڈ نے ۱۹۸۲ء سے اردو شاعری کے باوا آدم ولی احمد آبادی کے نام سے ایوارڈ دینے کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ ۱۹۸۴ء کا ولی ایوارڈ ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی کو دیا گیا۔ ایوارڈ کس کو دیا جائے یہ فیصلہ گجرات اردو بورڈ کی کمیٹی کرتی ہے۔ گجرات اردو بورڈ کے نائب صدر معین ایم سریس والا نے اعلان کیا ہے کہ ہر دوسرے سال حبیب سریس والا ٹرسٹ کی جانب سے یہ ایوارڈ دیا جائے گا۔ ایک سال گجرات اردو بورڈ کے نائب صدر نواب یوسف پٹھان کی جانب سے اس طرح ایوارڈ کا سلسلہ مسلسل چلتا رہے گا۔

جوش ملیح آبادی کئی مرتبہ احمد آباد آئے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے مشاعرے میں ایک مرتبہ ساغر نظامی، نیاز حیدر، جوش کے ساتھ ہی دہلی سے آئے تھے جوش کے پاکستان چلے جانے کے بعد ہندستان کا آخری سفر جو جوش ملیح آبادی نے کیا۔ ان دنوں جوش تقریباً بیس روز احمد آباد میں رہے اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ جوش کے پرائیویٹ سکریٹری عیش ٹونکی کے کچھ عزیز احمد آباد میں رہتے تھے۔ عیش ٹونکی نے احمد آباد میں اپنے بھائی نثار احمد خاں اور نوشہ خاں کو لکھا ہو گا کہ جوش صاحب ہندستان آرہے ہیں اور تقریباً تین ماہ قیام رہے گا۔ اس دوران آپ چاہیں تو کوئی مشاعرہ طے کریں میں جوش صاحب کو احمد آباد لا سکتا ہوں۔ چنانچہ مشاعرہ طے ہو گیا۔ جس روز جوش بمبئی سے احمد آباد آنے والے تھے اس روز ان کے استقبال کے لیے اسٹیشن پر شہر کے بہت سے ادیب و شعرا

موجود تھے۔ مولانا حبیب الرحمن غزنوی جمال الدین قادری تبسم مبارکپوری احسان جعفری اور راقم الحروف کے علاوہ بہت سے لوگ بہت سی انجمنوں کی جانب سے اسٹیشن پر جوش صاحب کا شاندار استقبال کیا گیا۔ جوش صاحب کے ٹھہرنے کا انتظام شہر کے ایک خوبصورت ہوٹل روپالی میں کیا گیا۔ مشاعرہ ٹکٹ سے تھا۔ یہ مشاعرہ دریا پور چار واٹ لبو اہر ہال میں منعقد کیا گیا۔ جوش کے نام پر لوگوں نے ٹکٹ بھی خوب خریدے اور ہال بھی بھر گیا۔ اس مشاعرے میں جوش اور عیش ٹونکی کے علاوہ کوئی دوسرا بیرونی شاعر نہیں تھا۔ تمام کے تمام مقامی شعرا تھے جوش اپنی عادت کے مطابق رات کے بارہ بجے سے قبل مشاعرے میں نہیں پہنچتے یہ ان کا دستور رہا ہے۔ تھوڑی دیر مشاعرے میں بیٹھے اس کے بعد اپنا کلام پڑھتے ہیں۔ دہلی کے مشاعروں میں بھی اکثر ایسا ہوتا رہا ہے۔ جوش آئے اپنا کلام سنایا اور چل دیے۔ کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوا ہے کہ جہاں بانیان مشاعرہ نے مناسب سمجھا کہ اب جوش کو پڑھنا چاہیے اس وقت وہ لوگ گئے اور جوش کی قیام گاہ سے جوش کو مشاعرے میں لے آئے۔ یہ سب عام طور سے بارہ بجے کے بعد ہی ہوتا رہا ہے۔

مشاعرہ شروع ہو گیا مقامی شعرا باری باری اپنا اپنا کلام سناتے رہے۔ حاضرین تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد جوش صاحب کے نام کی آواز لگاتے رہے اور بانی مشاعرہ بھی اعلان کرتے رہے کہ جوش صاحب اب آنے والے ہیں اب آنے والے ہیں۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد اعلان ہوتا کہ جوش صاحب اپنی قیام گاہ سے چل پڑے ہیں اور تھوڑی ہی دیر میں مشاعرے میں پہنچ رہے ہیں اسی کشمکش میں رات کے گیارہ بج گئے اور جوش صاحب کا کہیں پتہ نہیں۔ تقریباً ساڑھے گیارہ بجے رات کو حاضرین کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اس پر طرفہ تماشہ یہ کہ کسی من چلے نے یہ خبر اڑا دی کہ جوش صاحب احمد آباد میں آئے ہی نہیں ہیں۔ بس پھر کیا تھا۔ مشاعرے میں ہنگامہ ہو گیا۔ چپل اور جوتوں کی بارش سے اسٹیج بھی محفوظ نہ رہ سکا۔ شہر کے معتبر لوگ اٹھ کر آگے آئے اور انھوں نے حاضرین کو یقین دلایا کہ جوش صاحب احمد آباد میں ہیں اور وہ اب آنے ہی والے ہیں۔ تھوڑی ہی دیر میں جوش مشاعرے میں آ گئے۔ ململ کا کرتہ ڈھیلی موری کا پاجامہ ہاتھ میں پان کی ڈبی جوش صاحب کے لیے اسٹیج پر کرسی لگائی گئی۔ مائکروفون قریب لایا گیا۔ چند جملے ادا کرنے کے بعد جوش نے اپنا کلام سنانا شروع کیا ہال پر خاموشی طاری ہو گئی۔ لوگ جوش کو

دیکھنے کے زیادہ متمنی تھے۔

جوش اب پہلا جیسا نہیں پڑھ پا رہے تھے آواز میں بھی وہ گھن گرج نہیں رہی تھی وہ جوش ملیح آبادی جو طویل سے طویل نظمیں زبانی سُناتے تھے۔ آج حافظے کا یہ عالم تھا کہ پشت پر عیش ٹونکی کتاب لے کر بیٹھے تھے اور ہر بند کا پہلا مصرع جوش صاحب کو بتاتے تھے اس کے بعد جوش پورا بند پڑھتے تھے۔ کبھی کبھی تو خود ٹھہر کر جوش صاحب کو پوچھنا پڑتا تھا کہ ہاں بھئی آگے کیا ہے۔ تقریباً ایک گھنٹے تک جوش رباعیاں اور نظمیں پڑھتے رہے اس کے بعد مشاعرہ برخاست ہو گیا۔ لیکن بانیٔ مشاعرہ کو تھوڑی خفت رہی کچھ دیر پہلے ہنگامے کی وجہ سے، اس کے بعد ایک مشاعرہ اور کیا گیا۔ یہ مشاعرہ بہت بڑے کھلے ہال میں کیا گیا۔ کئی ہزار کرسیاں لگائی گئیں۔ جوش صاحب کو گذشتہ مشاعرے کے ہنگامے کی تفصیل بتائی گئی اور ان کو رضا مند کر لیا گیا کہ اگر آپ شروع ہی سے مشاعرے میں حاضر رہیں تو مشاعرہ بہت کامیاب رہے گا۔ گذشتہ مشاعرے میں بہت سے لوگ آپ کی دیر سے حاضری کی وجہ سے اٹھ کر چلے گئے تھے۔ جوش صاحب رضا مند ہو گئے۔ اس طرح اس مرتبہ مشاعرے میں وہ مشاعرہ شروع ہوتے ہی آ گئے۔ یکے بعد دیگرے عیش ٹونکی اور جوش ملیح آبادی اپنا کلام سناتے رہے۔ لیکن حاضرین کی تعداد اس مرتبہ پہلے سے بھی کم تھی۔ تمام کرسیاں خالی پڑی رہیں۔ البتہ کسی طرح کا کوئی ہنگامہ نہیں ہوا۔ اس مشاعرے کے بعد بھی قریب ایک ہفتے تک جوش صاحب احمد آباد میں رہے۔ وارث علوی، محمد اسماعیل خالدی عزمی اکثر ملنے جایا کرتے تھے۔

کسی انجمن کی جانب سے کوئی خاص پروگرام جوش صاحب کے اعزاز میں نہیں ہوا اتنا بڑا شاعر بیس روز تک احمد آباد میں رہے اور کوئی ادبی ہنگامہ نہ ہو تعجب کی بات، نہ کسی اسکول کی طرف سے نہ یونیورسٹی کی طرف سے نہ کسی ادبی انجمن کی طرف سے، چنانچہ رسول احمد شیخ اور راقم الحروف نے مشورہ کیا کہ انجمن ترقی اُردو کی طرف سے جوش صاحب کو عصرانہ دینا چاہیے۔ اس وقت ہم دونوں انجمن ترقی اردو احمد آباد کی ضلعی شاخ کے سکریٹری اور جوائنٹ سکریٹری تھے۔

اس سلسلے میں مولانا حبیب الرحمن غزنوی صاحب سے بھی مشورہ لیا۔ انھوں نے کہا کہ آپ لوگ جوش سے مل کر طے کریں۔ اس کے بعد پروگرام ترتیب دے لیں گے۔

چنانچہ راقم الحروف اور رسول میاں شیخ شام کو اس ہوٹل پر گئے جہاں جوش صاحب قیام پذیر تھے۔ کمرے کے باہر عیش ٹونکی صاحب کرسی پر بیٹھے تھے ہم سے ملاقات اور آنے کی وجہ دریافت کی۔ ہم لوگوں نے اپنا تعارف کرایا اور مقصد کا اظہار کیا۔ جناب عیش صاحب نے فرمایا کہ اس وقت تو حضور شغل فرما رہے ہیں آپ پھر کسی وقت آیئے گا۔ لیکن ایک بات کا خیال رکھیے گا کہ جوش صاحب کو دعوت دینے تو سب آتے ہیں۔ لیکن کسی نے یہ نہیں سوچا کہ اس ہوٹل میں روزانہ سو روپیہ خرچ ہوتا ہے۔ اس پر بھی غور کر کے آیئے گا۔ ہم لوگ بد دل تو بہت ہوئے لیکن پھر یہ سوچا کہ یہ عیش صاحب کے الفاظ ہیں۔ ممکن ہے جوش صاحب کو خبر ہی نہ ہوتی ہو کہ عیش صاحب کس کو کس طرح جواب دیتے ہیں۔ اگر جوش صاحب سے براہ راست بات ہو جائے تو زیادہ بہتر، پورے واقعہ کی تفصیل سے مولانا حبیب الرحمن غزنوی صاحب کو آگاہ کیا اور اُن سے کہا کہ جوش صاحب سے آپ فون پر بات کریں۔ مولانا رضا مند نہ ہوئے اور کہنے لگے کہ میں شرابی آدمی سے فون پر بھی بات کرنا پسند نہیں کرتا۔" مولانا جانتے تھے کہ جوش شراب پیتے ہیں اور جوش کے متعلق سب ہی لوگ جانتے ہیں۔ لیکن گذشتہ روز کے واقعہ سے اور عیش صاحب کے جواب سے مولانا برہم ہو گئے۔ اس لیے ایسا جواب دیا اور پھر انجمن کا کوئی پروگرام طے نہیں ہوا۔ جوش صاحب بمبئی چلے گئے۔ اور وہاں جا کر اس بات کا اظہار بھی کیا کہ احمد آباد میں ایک دو شخص کے علاوہ کسی ادارے یا انجمن نے مجھ سے ملاقات نہیں کی۔ شاید جوش صاحب کو یہ غلط فہمی عیش صاحب کی وجہ سے ہوئی۔ بلکہ بمبئی میں تو کچھ لوگوں نے جوش صاحب سے کہا بھی کہ اگر آپ کو اپنا پرائیویٹ سکریٹری رکھنا ہی تھا تو کسی معقول آدمی کو رکھتے اور یہ شاعرِ انقلاب جوش ملیح آبادی کا ہندستان اور احمد آباد کا آخری سفر تھا۔

فخرِ گجرات فخر احمد آبادی

(پیدائش: ۱۸۹۳ء — وفات: ۱۹۶۸ء)

میں نے جب احمد آباد میں قدم رکھا۔ اور احمد آباد کی علمی و ادبی فضا میں جس نام کی گونج سنی وہ پہلا نام فخرِ گجرات فخر احمد آبادی کا تھا۔ بوڑھے ہوں یا جوان ادبی یا غیر ادبی لوگ غرض ہر شخص فخر احمد آبادی کا نام عزت و احترام سے لیتا تھا۔ فخر صاحب احمد آباد تین دروازے کے قریب محلہ کھاروکے نالے میں ۱۸۹۳ء میں پیدا ہوئے تقریباً نصف صدی تک علم و ادب کی خدمت کی۔ فخر صاحب کو حضرت سہیل سورتی سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ حضرت سہیل سورتی مشہور استاد شاعر جناب اعجاز بھڑوچی کے شاگرد تھے۔ اور اعجاز بھڑوچی کا تعلق مرزا اسد اللہ خاں غالب سے تھا اس اعتبار سے فخر احمد آبادی کا سلسلہ غالب سے جا ملتا ہے۔

فخر احمد آبادی نے احمد آباد اور گجرات میں علمی و ادبی فضا کو سازگار بنانے میں بہت بڑا کام کیا۔ لوگوں کو اردو پڑھنے لکھنے پر اکسانا اور شعر و شاعری کا ذوق پیدا کرنا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ آپ کے شاگرد پورے گجرات میں ہیں۔ جن میں کچھ شعرا نے احمد آباد میں امتیازی مقام حاصل کیا۔ مرزا کوثر بیگ، وحشی، فرخ احمد آبادی، شاغل نظامی، عقیل احمد آبادی، اکمل احمد آبادی، دلیر احمد آبادی، طالب ہاشمی فخری، تحیر فخری سنبھلی۔ سرزمین ولی احمد آبادی کو فخر گجرات نے شعر و سخن کا گلزار بنا دیا تھا۔ فخر صاحب کی زندگی میں حسینی دروازے کا مسالمہ ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ جو ہر سال محرم کی سات تاریخ کو بہت ہی اہتمام کے ساتھ فخر گجرات کی نگرانی میں منعقد ہوتا تھا۔ اور آج بھی یہ مسالمہ اسی طرح محرم کی ۷ تاریخ کو منعقد ہوتا ہے۔ اب یہ جگہ تبدیل ہوگئی ہے۔ اور یہ مسالمہ حضرت موسیٰ میاں صاحب جانشین

درگاہ "حضرت شاہ عالم" اپنی نگرانی میں منعقد کراتے ہیں۔

جیسا کہ میں اوپر ذکر کر چکا ہوں فخر گجرات کا نام ہر کوئی عزت و احترام سے لیتا تھا چنانچہ مجھے اس ہستی کو دیکھنے اور ملنے کا اشتیاق پیدا ہوا۔ حالانکہ میں اس زمانے میں شعر نہیں کہتا تھا۔ لیکن ادب اور مشاعروں سے ایک خاص لگاؤ تھا۔ چند روز بعد شہر میں ایک آل انڈیا مشاعرے کے پوسٹر آویزاں نظر آئے۔ جن میں بیرونی شعراء کے علاوہ فخر گجرات کا نام بھی سرفہرست تھا۔ یہ مشاعرہ غالباً یتیم خانے میں منعقد کیا گیا تھا۔ وقت مقررہ سے قبل ہی مشاعرہ گاہ میں پہنچ گیا تھا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد شعرا آنے شروع ہوئے۔ انجم فوقی بدایونی یہ فخر گجرات کے ہمعصر تھے۔ اور ان کے شاگردوں کی تعداد بھی کافی تھی۔ آگے آگے انجم فوقی بدایونی اور ان کے پیچھے ان کے شاگردوں کا غول۔ اس زمانے کا یہی رواج تھا۔

انجم صاحب اسٹیج پر جا کر بیٹھ گئے۔ اور ان کے پیچھے ان کے شاگرد کچھ دیر بعد زخمی دہلوی، حزیں قریشی، شہیم احمد آبادی، مہر احمد آبادی، یہ سب مقامی شعراء اسٹیج پر تشریف لے آئے۔ چند لمحوں بعد ایک شخص وارد ہوا۔ سفید شیروانی، سفید پاجامہ، سفید داڑھی، سر پر ترکی ٹوپی، ساتھ میں کافی لوگ تھے۔ اسٹیج پر سب نے استقبال کیا۔ سامعین کی نظریں آنے والے شخص کی طرف مرکوز ہوگئیں۔ میں نے قریب بیٹھے ہوئے لوگوں سے پوچھا۔ یہ کون صاحب ہیں جواب ملا فخر گجرات۔ واقعی چال ڈھال، متانت، سنجیدگی، بزرگی سے متاثر کرنے والی شخصیت۔ تحت اللفظ میں بلند آواز سے پڑھنے کا انداز انتہائی دلکش تھا۔ اس مشاعرے میں کون کون سے بیرونی شعرا شریک تھے۔ اب کوئی بھی نام ذہن میں نہیں ہے۔ غالباً ظریف دہلوی بھی اس مشاعرے میں شریک تھے۔ انھوں نے اپنی احمد آباد کی آمد کے سلسلے میں ایک قطعہ پڑھا تھا جس کے دو مصرعے ذہن میں رہ گئے ہیں۔

دھول میں اور پسینے میں نہاتے آئے
تیل کی پھلکیاں اور سیو چباتے آئے

اس مشاعرے میں احمد آباد کے ایک نوجوان شاعر مہر احمد آبادی نے سامعین کو بہت متاثر کیا۔ گودھرا میں آگ لگنے کا واقعہ اس وقت نیا نیا تھا اور اس کی

مناسبت سے مہر احمد آبادی نے جو نظم پڑھی تھی۔ اس کا ٹیپ کا مصرع کچھ اس طرح تھا۔

"جلتا ہے گجرات رے ساتھی جلتا ہے گجرات"

غرض فخر گجرات سے یہ پہلی ملاقات تھی۔ اور اس کے بعد تو بارہا مشاعروں میں دیکھا اور ساتھ مشاعرے بھی پڑھے۔

اساتذہ میں چشمکیں۔ اس زمانے کا دستور تھا اور غالباً ہر جگہ ہر شہر میں ہوتی تھیں۔ چنانچہ احمد آباد میں بھی یہی کچھ ہوتا تھا۔ انجم فوقی بدایونی کے شاگردوں کی تعداد بھی کافی تھی لیکن بشیر احمد خاں زخمی کا کوئی شاگرد نہ تھا۔ اور وہ ہر معرکہ میں تنہا مقابلہ کرتے تھے۔ سُنا ہے اس زمانے میں شاگرد شعرا کی بہتات کے پیش نظر ایک فی البدیہہ مشاعرہ بھی منعقد ہوا۔ جس میں کچھ شعرا وقت مقررہ تک بھی شعر نہ کہہ سکے۔ اور کاغذ کورا ہی چھوڑ آئے۔

اساتذہ کی بر سر مشاعرہ نوک جھونک اور فی البدیہہ اشعار کبھی کبھی بہت لطف دے جاتے تھے۔ حکیم بشیر احمد خاں زخمی دہلوی کے ساتھ فخر گجرات کی نوک جھونک ایک طویل عرصے تک چلی۔ لیکن دونوں اساتذہ ایک دوسرے کا احترام ملحوظ خاطر رکھتے تھے۔ کبھی بھی کوئی بد اخلاقی سرزد نہ ہوتی تھی۔ زخمی صاحب کے ساتھ ایک اُلجھن یہ تھی کہ پڑھنے کا مقام سب سے آخر میں ہوتا تھا۔ اور فخر گجرات اپنی ضعیف العمری اور علالت کی وجہ سے اپنے مقام سے قبل ہی پڑھ لیا کرتے تھے۔ اور مشاعرے سے رخصت لے لیا کرتے تھے۔ اگر کبھی کوئی قطعہ یا شعر جس میں استاد زخمی کی طرف اشارہ ہوتا تھا۔ زخمی صاحب اس کا جواب اسی وقت فی البدیہہ کہہ لیا کرتے تھے لیکن مدِ مقابل سُننے والا نہ تھا۔ صرف شاگردوں کی زبانی فخر صاحب کو اطلاع ملتی تھی اور اس کا جواب کسی اگلے مشاعرے کے لیے محفوظ ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ رکھیال روڈ پر مشاعرہ تھا مصرع طرح تھا۔

"انساں بنا دیا ستم روزگار نے"

فخر گجرات نے طرح میں جو غزل پڑھی۔ مقطع میں زخمی صاحب کی طرف اشارہ تھا۔

اے فخر ہوں میں زندہ سلامت ابھی تلک
بیکا نہ بال بھی کیا دُشمن کے وار نے

اور زخمی صاحب نے بھی اس کا فی البدیہہ جواب دیا۔ غرض اس قسم کی چشمکیں اساتذہ میں چلتی رہتی تھیں جو بہت لُطف دیتی تھیں۔ اور نئے شعرا کو سیکھنے کا بھی موقع ملتا تھا۔ معمولی سی معمولی غلطی پر بھی اساتذہ کی نظر رہتی تھی کہیں بھی کسی سے چُوک یا سہو ہوتا فوراً اس کا اظہار ہو جاتا تھا۔ غرض فخر صاحب جب تک زندہ رہے علم و ادب کی خدمت کرتے رہے۔ گجرات کی تاریخ میں جلی حروف میں فخر گجرات کا نام لکھا جائے گا۔ آپ کی قبر موسیٰ سہاگ قبرستان میں ہے اور ایک خوبصورت مقبرہ کی شکل دے دی گئی ہے۔ مقبرے کے اطراف میں دیواروں پر فخر گجرات کی رباعیاں اور اشعار تحریر ہیں۔

فخر گجرات کا نعتیہ کلام منجانۂ غوث ان کی زندگی ہی میں شائع ہو گیا تھا لیکن غزلیات کا کوئی مجموعہ اب تک شائع نہیں ہو سکا۔ کاش شاگردانِ فخر گجرات یہ کام اپنے ذمہ لیں۔ اور اس شاعرِ بے بدل کا کلام جس نے گجرات میں نصف صدی تک اردو ادب کی خدمت کی محفوظ کریں ورنہ کتنے ہی شاعروں کی طرح فخر صاحب کے کلام کے اوراق پریشان بھی وقت کی گرد میں دب جائیں گے۔ اللہ پاک اُن کے شاگردوں کو یہ توفیق دے۔ فخر گجرات کی یاد میں ہزاروں روپیہ خرچ کر کے ایک مشاعرے کا اہتمام کرنا اس سے کہیں بڑی بات یہ ہے کہ اس شاعر کا کلام طبع کرا کے محفوظ کر دیا جائے۔ تاکہ آنے والی نسلیں استفادہ کر سکیں۔

ہر فخر ہر کمال ہے کوشش پہ منحصر
دلّی میں جو رہے وہی اہلِ زباں نہیں

☆

اے فخر ہر کمال ہے کوشش پہ منحصر
دلّی میں جو رہے وہی اہلِ زباں نہیں

☆

کلیم احمد آبادی

(پیدائش: ۱۸۸۱ء — وفات: ۱۹۶۷ء)

نام عبدالکریم تخلص کلیم سنہ ۱۳۰۰ھ میں پیدا ہوئے تقریباً نوے سال سے کچھ زیادہ عمر پائی۔ قریشی برادری سے تعلق، کلیم احمد آبادی نے جس زمانہ اور جس ماحول میں آنکھ کھولی تھی۔ اس وقت قریشی برادری میں اعلیٰ تعلیم کا رواج نہ تھا۔ بس تھوڑی بہت تعلیم ضروری سمجھی جاتی تھی۔ چنانچہ کلیم صاحب نے بھی معمولی تعلیم حاصل کی۔ لیکن مزاج کو بچپن ہی سے شعر و شاعری اور ادب سے لگاؤ تھا۔ اس لیے مطالعہ کا شوق جاری رہا۔ گجراتی اور اردو زبان کی کتابوں کا مطالعہ کرتے رہے زندگی کے ابتدائی ایام عسرت میں بسر کیے اور ناسازگار حالات کا مقابلہ نہایت دل جمعی سے کرتے رہے اسی زمانے میں کلیم صاحب کی ملاقات عزیز اٹاوی سے ہوئی۔ عزیز اٹاوی احمد آباد میں کتابوں کی تجارت کرتے تھے اور شعر و سخن کا ذوق بھی بہت اچھا رکھتے تھے۔ عزیز اٹاوی کا سلسلۂ فنِ شعر و سخن مرزا غالب سے ملتا ہے۔ کلیم صاحب نے پہلی فرصت میں عزیز اٹاوی کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا اور فنِ شعر و سخن کی آبیاری میں مصروف ہو گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ دہلی میں داغ اور لکھنؤ میں امیر و جلال کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ کلیم عزیز اٹاوی کی کتابوں کی دکان سے استفادہ حاصل کرتے رہے۔

مطالعہ کے ساتھ ساتھ مشقِ سخن بھی جاری رہی اور اس طرح کلیم صاحب نے ۱۹۱۱ء سے باقاعدہ شعر کہنا شروع کر دیا۔ عزیز اٹاوی کی توجہ اور اصلاح سے کلیم صاحب کی ادبی صلاحیتوں کو کافی فروغ ملا۔ اور تھوڑی سی مشقِ سخن ہی میں عزیز اٹاوی نے کلیم صاحب کو فنِ سخن کے رموز و نکات سمجھا دیئے۔ کلیم صاحب ۱۹۱۲ء

میں بمبئی چلے گئے۔ تقریباً چار سال بمبئی رہے اور وہاں کی ادبی محفلوں میں شرکت کرتے رہے۔ بہت جلد وہاں کے ادبی حلقوں میں مقبول ہو گئے اور احترام کی نظر سے دیکھے جانے لگے۔ آپ کا ابتدائی کلام ۱۹۱۲ء سے ۱۹۱۵ء "جلوۂ یار میرٹھ" اور ترقی سخن میں چھپتا رہا۔ اور یہ رسائل اس وقت کے اچھے اور معیاری رسائل تھے۔ کلیم صاحب نے ذاتی محنت و شوق مطالعہ سے اردو اور گجراتی زبان پر دسترس حاصل کر لی۔ شعر دونوں ہی زبانوں میں کہتے تھے۔ لیکن اردو سے زیادہ شغف رہا۔ صنفِ سخن میں غزل کو پسند کیا۔ اور غزلیں ہی کہتے رہے۔ ۱۹۵۱ء میں احمد آباد کے عوام نے اپنے مایۂ ناز شاعر کی جوبلی نہایت ہی تزک و احتشام کے ساتھ منائی اور تین روز تک اجلاس ہوئے۔

ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی، نجیب اشرف ندوی، محمد ابراہیم ڈار اور مولانا ابوظفر ندوی نے مقالے پیش کیے۔ باشندگانِ احمد آباد کی طرف سے ایک ہزار روپے کی تھیلی پیش کی گئی۔ تین روزہ اجلاس کے درمیان ایک روز آل انڈیا مشاعرہ بھی ہوا۔

جس میں شکیل بدایونی، جگن ناتھ آزاد اور دوسرے معروف شعرا نے شرکت کی۔ غالباً ہندستان اور پاکستان میں یہ اپنی نوعیت کا پہلا پروگرام تھا کہ کسی شاعر کی ادبی خدمات کا اعتراف اس کی زندگی میں کیا گیا ہو اور اس طرح جشن منایا گیا ہو۔

کلیم صاحب کو میں نے دو تین مرتبہ مشاعروں میں پڑھتے دیکھا اور سنا ہے بہت ہی خوبصورت ترنم کے ساتھ زوردار آواز سے پڑھتے تھے۔ اور سامعین ہمہ تن گوش ہو جاتے تھے۔ احمد آباد کے اچھے اور کامیاب شاعروں میں کلیم احمد آبادی کا شمار ہوتا ہے۔ میں نے موصوف کو آخری عمر میں یعنی قریب اسی سال کی عمر میں پڑھتے دیکھا اور سنا ہے۔ جب کہ بصارت جواب دے چکی تھی اور سماعت بھی کمزور ہو گئی تھی۔ کلیم صاحب کو جن لوگوں نے جوانی کے عالم میں سنا تھا۔ ان کا کہنا ہے کہ کلیم صاحب جیسا اچھا جوانی کے ایام میں پڑھتے تھے۔ اسّی سال کی عمر میں بھی آواز اور پڑھنے کے انداز میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ کلیم صاحب سے ان

کے مکان پر ملنے کا بارہا اتفاق ہوا وہ اس لیے کہ کلیم صاحب کے فرزند جمیل کلیمی جو خود بھی ایک اچھے شاعر تھے۔ میرے حلقۂ احباب میں شامل تھے۔ روزانہ ایک دوسرے سے ملتے تھے۔

ہر ہفتے شعروشاعری کی محفل منعقد ہوتی تھی۔ جس میں محمد علوی، عادل منصوری حزیں قریشی اور اس وقت کے کئی اہم شعرا شریک ہوتے تھے۔ جمیل صاحب اکثر مشاعروں اور نشستوں کی روداد کلیم صاحب کو سناتے تھے۔ کبھی کہتے کہ وہ آپ کو یاد کر رہے ہیں۔ میں کلیم صاحب سے ملاقات کرتا۔ اپنی غزل سناتا کبھی ایسا بھی ہوا کہ کلیم صاحب نے بھی اسی زمین میں شعر کہے اور مجھے سنائے۔ آخری ایام میں شعرگوئی کا شوق جاری تھا۔ ایک پلنگ پر بیٹھے رہتے تھے۔ نماز اور وظائف پابندی سے ادا کرتے تھے۔ سگریٹ کے شوقین تھے۔ اس زمانے میں تاج مارکہ سگریٹ، بیڑی اور حقہ پینے والوں کی خاص پسند تھا۔ کلیم صاحب بھی سگریٹ پیتے تھے۔ ایک خاص انداز سے سگریٹ کا کش لگا کر لطف لیتے تھے۔ اور اپنے اشعار سناتے، آواز میں گھن گرج تھی۔ ہر جگہ اور ہر زمانے میں استادوں میں جھڑپیں ہوتی رہی ہیں۔ لیکن میں نے کلیم صاحب کو اس سے مبرّا پایا۔ اپنے ہمعصر شعرا کے لیے کبھی بھی ان کی زبان سے کوئی سخت کلمہ نہیں سنا۔ اپنی دھن میں مست رہتے تھے۔ یادِ اللہ اور شعرگوئی ہی مشغلہ تھا۔ کاروبار اپنی زندگی ہی میں اپنے لڑکے جمیل کلیمی کو سونپ دیا تھا۔ جو کلیم بکڈپو کے نام سے آج بھی منسوب ہے۔ کلیم بکڈپو کتابوں کی دکان ہی نہیں بلکہ شاعروں اور ادیبوں کا مرکز بھی تھا۔

نمونۂ کلام:

جو تیری دید سے پائی تھی تازگی میں نے
وہ سب خزاں کی روش پر بکھیر دی میں نے
وفا شعار نہ بنتا نہ کوئی دُکھ پاتا
خرید لی ہے زمانہ سے دشمنی میں نے
پکارتا ہوں خدا کو خدا نہیں سنتا

نہ جانے کس کے لیے کی ہے بندگی میں نے
زمانہ دیکھیے کیا اپنی چال چلتا ہے
فنا کے رُخ پہ لگا دی ہے زندگی میں نے
مرے خیال کی گنجائشوں کو دیکھ ذرا
کہ دشمنی بھی بنائی ہے دوستی میں نے
فروغ سے ہے کلیم اصلیت کا اندازہ
سنبھل سنبھل کے بہت ان سے بات کی میں نے
چلے جو موج محبت سبک روی سے چلے
یہ کیا کہ شورشِ بے اختیار بن جائے
کچھ اس ادا سے شگفتہ ہوا ہے غنچۂ دل
خزاں بھی آئے تو فصلِ بہار بن جائے
سحر دعا کے لیے ہے دعا سحر کے لیے
کہو کلیم سے شب زندہ دار بن جائے

رازؔ صدیقی شاہجہانپوری

نام عبداللطیف وطن (یو۔پی) تلہر قصبہ محمدی رازؔ صدیقی شاہجہانپوری کے نام سے مشہور ہوئے۔ پچاس سال کی عمر میں کینسر کے مرض سے احمد آباد ہی میں انتقال ہوا۔ انتقال سے قبل ایک سال تک صاحب فراش رہے۔

رازؔ صاحب غالباً ۱۹۴۷ء سے قبل ہی احمد آباد آ گئے تھے۔ سارنگپور پل کے نیچے ایک چھوٹی سی دکان تھی۔ گھڑیوں کی مرمت کا کام کیا کرتے تھے۔ لانبا قد، چھریرا بدن، سر پر معمولی گھونگھریالے بال، بڑی موری کا پاجامہ اور شیروانی اکثر زیب تن کیا کرتے تھے۔ حضرت دلؔ شاہجہانپوری سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ شعر فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں کہتے تھے۔ فن عروض پر دسترس حاصل تھی۔ بہت ہی مخلص اور ملنسار شخصیت، تصنع اور بناوٹ سے بے نیاز۔ اس زمانے میں کتنے ہی شعرا مرحوم سے فیض حاصل کرتے تھے۔ جس میں راقم الحروف بھی شامل ہے لیکن زندگی بھر کسی پر یہ ظاہر نہیں کیا کہ فلاں شاعر میرا شاگرد ہے یا مجھ سے مشورہ کرتا ہے اگر کبھی کسی نے اس سلسلے میں دریافت بھی کیا تو مرحوم یہ کہہ کر بات ختم کر دیا کرتے تھے کہ ہم لوگ آپس میں دوست ہیں اور ایک دوسرے سے مشورہ کرتے ہیں۔ مشاعروں میں اکثر شرکت کرتے تھے اور اس وقت کے اساتذہ رازؔ صدیقی کو احترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اور ان کے علم و فن کی قدر بھی کرتے تھے۔ پڑھنے کا انداز انتہائی دلکش تھا۔ غزل ترنم سے پڑھتے تھے۔ میری پہلی ملاقات ایک دوست کے ذریعے رازؔ صاحب سے ہوئی۔ اس وقت میری شاعری کی ابتدا تھی۔ اور مجھے ایسے ماہرِ فن کی تلاش تھی جو صحیح مشورے دے سکے۔ چنانچہ رازؔ صاحب

سے چند ملاقاتوں کے بعد میں نے اپنی خواہش کا اظہار کیا اور رازؔ صاحب نے اسے قبول کر لیا۔ لیکن استادی شاگردی والی بات وہ پسند نہیں کرتے تھے۔ ہمیشہ دوست اور اچھے ساتھی کی طرح ملتے رہے۔ جبکہ عمر میں وہ مجھ سے کافی بڑے تھے۔ اور یہ سلسلہ ان کی حیات تک چلتا رہا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین سے وابستہ تھے۔ انھیں کے ایما پر ہم بھی انجمن کے ممبر بن گئے تھے۔ رازؔ صاحب اور ہم لوگ پابندی کے ساتھ انجمن کے جلسوں میں شرکت کرتے تھے۔ فارسی کی تھوڑی بہت تعلیم اور علم عروض میں نے رازؔ صدیقی ہی سے حاصل کیا وہ بڑے خلوص و محبت کے ساتھ عروضی و فنی نکات اکثر فرصت کے اوقات میں سمجھاتے رہتے تھے۔ متقدمین شعرا کے مطالعہ کی طرف اکثر احباب کی توجہ مبذول کراتے رہتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ جب تک آپ لوگ مطالعہ نہیں کریں گے۔ اچھے شعر نہیں کہہ سکیں گے۔ افسوس کہ عمر نے وفا نہ کی۔ آج ایسے مخلص لوگوں کی کمی کا احساس شدت سے ہوتا ہے۔ رازؔ صاحب کے قریبی اقارب میں ان کی ایک سگی بہن اور بہنوئی تھے۔ جو غالباً قصبہ محمدی میں آج بھی سکونت پذیر ہونگے۔ راز صدیقی نے شادی نہیں کی تھی۔ وہ سال دو سال میں اپنی بہن کے پاس ضرور جایا کرتے تھے اور ایک یا ڈیڑھ ماہ رہ کر واپس احمد آباد چلے آتے تھے۔ جب بھی آتے تو کہتے کہ بہن شادی کے لیے بہت کوشاں ہیں۔ لیکن رازؔ صاحب نے اس طرف سنجیدگی سے کبھی توجہ نہ دی۔ انھوں نے کھانا ہوٹل کا کھایا جس کی وجہ سے صحت پر بُرا اثر پڑا۔ آخری دنوں میں بہت کمزور ہو گئے تھے۔ اور جس دن سے کینسر کا علم ہوا مسلسل علاج کے باوجود روز بہ روز صحت گرتی ہی چلی گئی۔ آخر کار ۱۹۵۷ء میں غالباً مارچ یا اپریل میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ راز ایسے سراپا شرافت اور خلوص کے لوگ اب کہاں ملیں گے۔ میں نے ایک بار کوشش بھی کی کہ ان کا جتنا کلام ہے اسے شائع کر دیا جائے۔ مگر افسوس میں اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکا۔ چند اشعار ناظرین کے پیش خدمت ہیں جن سے رازؔ صاحب کی فنکارانہ صلاحیتوں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

رازؔ تو یہ پھر گیا پانی
کوئی چھینٹا جو آسماں سے گرا

میری نظروں نے چن لیا اس کو
پھول جو دستِ باغباں سے گرا
رازؔ وہ میکدہ بدوش آنکھیں
کیف برسا گئیں حیا کر کے
اس نے جبیں کا نہیں مقام کہیں
آپ کا سن لیا ہے نام کہیں
بیٹھ اے دل نظر ملائے بغیر
بندگی ہیں نہیں سلام کہیں

آتے ہی اُن کے روبرو سپنوں کی بات ہوگئی
لمحوں میں دن گزر گیا پلکوں میں رات ہوگئی
تم نے جو تو سے تم کہا کھل گئے زندگی کے پھول
تم نے نقاب اُلٹ دیا شرحِ حیات ہوگئی
رازؔ دلِ شکستہ کا آ ہی گیا اُنھیں خیال
کانٹوں کو چومتے ہی آج پھولوں سے بات ہوگئی

زمانہ چال قیامت کی چل گیا ہے ہے
میں دیکھتا ہی رہا ہاتھ کی لکیروں کو
ڈرا ہوں یوں بھی سوا دیکھ کر نکیروں کو
سفیر بن کے نہ دیکھا ہم سفیروں کو

ابھی سے گرم ہیں کیوں ناقدانِ بزمِ سخن
ابھی تو اور تخنور بدلنے والے ہیں

☆

حکیم بشیر احمد خاں زخمی دہلوی

(پیدائش: ۱۹۰۵ء ——— وفات: ۱۹۶۶ء)

کھدر کی ٹوپی کھدر کا پاجامہ اور کرتا، کھدر کی جاکٹ۔ داڑھی مونچھیں صاف۔ سر سے پیر تک گاندھی وادی۔ مرتے دم تک کانگریس سے وابستہ رہے۔ ہمیشہ صاف کھری بات کہتے تھے۔ نہایت بے باک اور نڈر۔ اصول کے پابند، ایک مرتبہ کارپوریشن کا الیکشن لڑا اور کامیاب رہے۔ رشوت اور جھوٹ سے ہمیشہ پرہیز کیا ہمیشہ ایک ہی حال میں اپنی وضع قطع کے ساتھ زندگی بسر کی۔ ان کی اس سخت اصول پسندی کی وجہ سے اکثر لوگ ان سے خفا بھی رہتے تھے۔ شاعری میں اُستادانہ حیثیت کے حامل۔ فنِ شاعری اور علم عروض پر گہری دسترس۔ شعر میں کسی طرح کا عیب برداشت نہیں کرتے تھے خواہ وہ اپنے یہاں ہو یا دوسرے کے یہاں، برملا اظہار کر دینا۔ اُن کی فطرت میں شامل تھا۔ فخریات اور ہمعصر اُستاد شعرا کے ساتھ اُن کی جھڑپیں مشہور ہیں۔ زود گوئی اور فی البدیہہ اشعار کہنے میں ماہر۔ اچھا شعر خواہ کسی کا بھی ہو خواب داد سے نوازتے تھے ایک مرتبہ راقم الحروف نے ان سے کہا کہ زخمی صاحب آپ کی یہ عادت مجھے اچھی نہیں لگتی کہ آپ شعرا کو برسرِ مشاعرہ ٹوک دیتے ہیں۔ یہ سنتے ہی ماتھے پر بل پڑ گئے، رحمت میں تو نومشق شعرا کی ہمیشہ حوصلہ افزائی کرتا ہوں۔ لیکن مجھے جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ فلاں شاعر نے اصلاح کا کام شروع کر دیا ہے اور اپنے شاگرد بنالئے ہیں۔ تب میں اس شاعر پر خاص نظر رکھتا ہوں اور اس کی غلطیوں کو برداشت نہیں کرتا۔ فنِ شعر برسوں کے ریاض اور محنت کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ آج کل شاعروں نے شاگرد بنانا اور اصلاح کرنا ایک فیشن بنا لیا ہے۔ زخمی صاحب کے جواب میں معقولیت نظر آئی اور میں خاموش ہوگیا۔

زخمی صاحب بیان یزدانی میرٹھی کے شاگرد تھے۔ دہلی کے پاس گڑگانو ایک مشہور قصبہ ہے۔ یہی ان کا وطن تھا۔ مستقل سکونت احمدآباد ہی میں رہی اور یہیں انتقال ہوا احمدآباد آنے کے بعد کالوپور گجراتی دواخانے میں ملازمت کی۔ بعد میں اپنا خود کا مطب کرلیا تھا۔ اس کے بعد کالوپور دروازے کے باہر ایک چائے کا ہوٹل کرلیا۔ آج بھی ان کے بیوی بچے یہیں مقیم ہیں۔ اور وہ ہوٹل ان کے بچے چلاتے ہیں۔ جنگ آزادی میں ایک دومرتبہ جیل بھی گئے۔ مشاعروں میں اکثر فخر گجرات، نصیر صاحب اور دیگر اساتذہ کے ساتھ ادبی چوٹیں ہوتی رہتی، جو بہت پُرلطف اور معلوماتی ہوتی تھیں۔ میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ کسی نے کوئی گھٹیا قسم کا کسی کی ذات پر حملہ کیا ہو۔ ایک دوسرے کا ادب ہمیشہ ملحوظ رکھتے تھے۔ زخمی صاحب شاعری کے علاوہ دورانِ گفتگو زبان کے معاملے میں بہت محتاط رہتے تھے۔

کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ کسی کی زبان سے کسی لفظ کا غلط تلفظ ادا ہوا اور زخمی صاحب نے فوراً ٹوک دیا۔ کبھی کبھی یہ انداز بحث کی صورت اختیار کرلیتا۔ ایک روز دورانِ گفتگو نصیری صاحب سے کسی بات پر گرما گرمی ہوگئی۔ یار لوگوں نے بہت لطف لیا۔ نصیر صاحب ناراض ہوگئے اور بہت دن تک بات چیت کا سلسلہ منقطع رہا۔ لیکن معمول میں کوئی فرق نہیں آیا۔ زخمی صاحب بھی روزانہ آتے رہے اور نصیر صاحب بھی۔ اگر کبھی زخمی صاحب پہلے آگئے اور نصیر صاحب نہیں آئے تو آتے ہی دریافت کیا کیوں آج نصیر نہیں آئے۔ اور اگر پہلے نصیر صاحب آگئے تو وہ زخمی صاحب کی خیر پوچھ لیا کرتے۔ لیکن گفتگو بند رہی۔ اس عرصہ میں نصیری صاحب کی لڑکی کی شادی طے پائی۔ رقعے تقسیم کیے گئے۔ زخمی صاحب سے میری ملاقات ہوگئی۔ میں نے کہا۔ "کہیے زخمی صاحب آپ جائیں گے نصیر صاحب کے یہاں شادی میں؟ میرا خیال تھا جواب نفی میں ملے گا۔" ہاں جاؤں گا ضرور جاؤں گا۔ اُس کی لڑکی کی شادی ہے۔ اگر لڑکے کی ہوتی تو شاید نہ جاتا۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ افسوس! اب ایسے وضعدار لوگ کہاں ملیں گے نہ نصیر صاحب رہے نہ زخمی صاحب صرف یادیں باقی رہ گئیں ہیں۔ زخمی صاحب نے شادی میں شرکت کی۔ دونوں اُستاد گلے ملے۔ نہ شکوہ نہ شکایت، وہی پُرانا معمول روز ملنا، خوش گپیاں کرنا، شاعری اور ادب پر گفتگو کرنا۔ اب ایسے اگلے وقتوں کے

لوگوں کا ملنا مشکل ہے۔ دمہ کے پُرانے مریض تھے۔ اور اسی مرض نے ان کی جان لے لی۔ زخمی صاحب نے تقریباً پینسٹھ برس کی عمر پائی۔ احمدآباد کے ادبی ماحول کو بنانے سنوارنے میں زخمی صاحب کا ایک خاص حصّہ ہے جو بھلایا نہیں جاسکتا۔ انتقال کے بعد ہم لوگوں نے کوشش کرکے ان کا کلام ادارۂ اشاعت اردو کے ذریعہ شائع کرایا۔ ان کے مجموعۂ کلام کا نام "کائنات" ہے۔

نمونۂ کلام:

بلا سے ہم کہیں پامال ہوں کہ مر جائیں
یہ آرزو ہے کہ یہ راستے سنور جائیں
ہرن سمجھ کے شکاری شکار کرتا ہے
یہ شیر ہیں کہیں ایسا نہ ہو بپھر جائیں
ذلیل ہو کے بھی کانٹے رہیں گے گلشن میں
مگر وہ پھول نگاہوں سے جو اُتر جائیں
یہ چند سانس غنیمت ہیں کچھ تو کہہ سن لوں
قریب آئیں اقارب یہ چارہ گر جائیں
جان پر جو کھیلتا ہے جام پر
دور چلتا ہے اسی کے نام پر
ہو نہ غافل آکے منزل کے قریب
لاکھ خطرے ہیں انھیں دو گام پر
ان کے قدموں کے نشاں آئے نظر
سجدہ لازم ہوگیا ہر گام پر ۔۔۔۔
کم نصیبی فرصتِ ماتم کہاں
ہنس رہا ہوں کوششِ ناکام پر

قطعات:

جنت میں ہوئی بھول ہوا دنیا میں آنا
دنیا میں ہوئی بھول تو دوزخ ہے ٹھکانا

لیکن جو کوئی بھول ہوئی مجھ سے وہاں بھی
للّٰہ بتا پھر مرا کس جا ہے ٹھکانا

⁂

زاہد کو بس یہ دھن ہے کہ صوم و حج و زکواۃ
کہتا ہے فلسفی بھی نئی روز ایک بات
زخمی سب اپنے اپنے ٹھکانے پہ ٹھیک ہیں
سمجھا نہیں ہے کوئی ابھی مقصدِ حیات

⁂

عنوان ہے گناہ میری رسم و راہ کا
عادی ہوں میں شروع سے کارِ سیاہ کا
اب دوسرے گناہ کی تیاریوں میں ہوں
عالم نتیجہ ہے مرے پہلے گناہ کا

⁂

خلیل احمد آبادی

پورا نام تو نہیں معلوم ہو سکا لیکن احمد آباد کے لوگ انھیں خلیل احمد آبادی کے نام سے جانتے تھے۔ غالباً ۱۹۴۷ء یا ۱۹۴۸ء کا زمانہ تھا۔ خلیل صاحب سے میری پہلی ملاقات ہوئی اس وقت ان کی عمر پینسٹھ سال رہی ہوگی، دل موہ لینے والی شخصیت حسین چہرہ۔ خشخشی داڑھی عتاب آلود لمبی مونچھیں، گفتگو جوانوں جیسی، آڑا پاجامہ، شیروانی اکثر زیب تن کرتے تھے۔ سر پر جناح کیپ ہوتی جو اکثر ترچھی ہی رہتی تھی۔ شعرا نے شاید کج کلاہ اسی کو کہا ہے۔ خلیل صاحب کو دیکھ کر اور ان سے گفتگو کر کے کوئی بھی شخص یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ شخص گجرات کا باشندہ ہوگا۔ لکھنوی ٹھاٹ باٹ، لکھنوی مزاج، متانت و سنجیدگی اور انکسار کا نمونہ۔ یہ ہے خلیل صاحب کی قلمی تصویر۔ اور یہ سطریں لکھتے وقت اب بھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ خلیل احمد آبادی کی قلمی تصویر الفاظ کے ذریعے کھینچنے میں اب بھی انصاف نہیں کر پایا ہوں۔

خلیل صاحب کس سن میں پیدا ہوئے اس کی صحیح معلومات اب دشوار ہے خلیل صاحب کا مکان ریلیف روڈ زکریا مسجد کے سامنے امپریل ہوٹل کے قریب ایک وسیع میدان میں واقع تھا۔ لیکن اب وہاں نہ وہ ہوٹل ہے اور نہ میدان۔ چاروں طرف دکانیں ہی دکانیں بن گئی ہیں۔ خلیل صاحب کا روزانہ کا معمول تھا کہ مکان کے باہر میدان میں شام کو پانی چھڑکوا کر کرسیوں اور بینچ وغیرہ سے آراستہ کر دیا کرتے تھے۔ مغرب کے بعد وہاں احباب کی آمد کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ روزانہ آنے والوں میں راز شاہ جہاں پوری۔ اشعر لوری۔ جوہر احمد آبادی، عزیز جاوید، حائل بھوپالی، راقم الحروف، مرزا نوشر بیگ احمد آبادی، نادم اندوروی، جوزف انور اجمیری،

گاہے گاہے آجایا کرتے تھے۔ جناب خالدی عزمی صاحب کا ورود احمد آباد میں ان دنوں نیا نیا تھا۔ کبھی کبھی آجایا کرتے تھے۔ خلیل صاحب اپنے احباب و شعرا کو دور ہی سے دیکھ کر کھڑے ہو جایا کرتے تھے اور لکھنوی یا حیدر آبادی وضع قطع کے ساتھ فرشی سلام کرتے۔ چھوٹے بڑے کی کوئی قید نہ تھی۔ سب کے ساتھ اسی طرح سے پیش آتے تھے۔ سگریٹ کے شوقین تھے۔ اس زمانہ میں سب سے اچھی سگریٹ کیپسٹن ہوتی تھی یہی سگریٹ وہ پیتے تھے۔ سگریٹ کا پیکٹ میں نے کبھی ان کے پاس نہیں دیکھا مکان کے سامنے ہی پان کی دکان تھی۔ گفتگو کے دوران گھنٹے آدھے گھنٹے کے بعد اٹھتے اور پان کی دکان سے سگریٹ خریدتے سلگاتے اور کش لگاتے ہوئے آتے اور محفلِ یاراں کی گفتگو صرف ادبی ہوتی۔ سیاسی مسائل کبھی درمیان میں نہیں آتے۔ آنے والے شعرا میں کوئی نہ کوئی تو ضرور نئی غزل کہہ کر لاتا تھا۔ ادبی لطائف اور شاعری بس یہی مشغلہ تھا۔ کبھی کبھی تو کافی لوگ اکٹھا ہو جایا کرتے تھے۔ اور اس وقت یہ بات پورے شہر میں مشہور ہو گئی تھی کہ اگر کسی شاعر کو تلاش کرنا ہو تو رات کو نو بجے کے بعد خلیل صاحب کے یہاں چلا جائے۔

محفلِ سماع میں صوفیائے کرام کو وجد کی حالت میں دیکھا اور سنا ہے۔ لیکن محفلِ شعر و سخن میں ایسا کبھی نہیں دیکھا تھا۔ خلیل صاحب پر گاہے گاہے ایسی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ دو مرتبہ خلیل صاحب کے مکان میں ایسا ہی اتفاق ہوا مخصوص شعری نشست منعقد تھی۔ شعرا باری باری اپنا کلام سنا رہے تھے کہ اچانک کوئی شعر خلیل صاحب کے دل کو چھو کر گزر گیا۔ پھر کیا تھا۔ ایک حق کا نعرہ بلند ہوا اور خلیل صاحب عالمِ وجد میں آ گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے غشی طاری ہو گئی۔ محفلِ شعر و سخن چند لمحے کے لیے ساکت ہو گئی۔ سب لوگ خلیل صاحب کی طرف متوجہ ہو گئے۔ پانی وغیرہ پلایا گیا۔ تھوڑی دیر میں خلیل صاحب اپنی اصلی حالت میں آ گئے۔ اور شعرائے کرام اپنے اشعار سنانے لگے۔ خلیل صاحب کے پڑھنے کا انداز بھی نرالا تھا۔ نہایت پاٹ دار آواز سے تحت اللفظ میں پڑھتے تھے اور پڑھتے وقت ایسی کیفیت ہو جاتی تھی کہ خود ہی اپنے اشعار سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ دوسرے لوگ جب داد دیتے تو نہایت سلیقہ کے ساتھ لکھنوی انداز میں سر

جھکا کر آداب کرتے جیسا پرانے شعرا کا دستور تھا جس نشست سے بیٹھتے تھے۔ آخر وقت تک پہلو نہیں بدلتے تھے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا تھا خلیل صاحب اپنی غزل پڑھنے کے لیے کسی مترنم شخص کو تیار کرتے اور اس سے غزل سنتے۔ ہم لوگ تو لطف اندوز ہوتے ہم لوگوں کو مخاطب کر کے خود ہی بے اختیار داد بھی دیتے تھے یہ تھے ہمارے خلیل صاحب جواب ہمارے درمیان نہیں رہے۔ میں نے دل کے پھپھولے اس لیے کہا کہ بڑے مشاعروں میں انھیں صرف دو مرتبہ شریک ہوتے دیکھا۔

پریما بھائی ہال میں مشاعرہ تھا۔ کون سا سال تھا یاد نہیں۔ مشاعرے کی صدارت فخرِ گجرات جناب فخر احمد آبادی کر رہے تھے۔ جب خلیل صاحب کے نام کا اعلان ہوا تو وہ مائیکرو فون پر تشریف لائے۔ اسی آداب وضع کے ساتھ جو میں اوپر تحریر کر چکا ہوں "مطلع ملاحظہ فرمایئے" سامعین میں نوجوانوں کی تعداد زیادہ تھی۔ مطلع جس مطلع تک تو خاموشی رہی۔

لیکن جیسے ہی شعر پڑھا ہال میں نوجوانوں میں ہلکا سا شور ہوا۔ شاید ان لوگوں کو ایسی وضع قطع اور ایسے آداب سے پہلی مرتبہ واسطہ پڑا تھا۔ تالیاں بجنا شروع ہو گئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے پورے ہال میں تالیاں بجنے لگیں۔ تقریباً پانچ منٹ تک یہ عالم رہا۔ خلیل صاحب شعر پڑھ رہے ہیں۔ کوئی سن نہیں رہا تھا۔ فخر صاحب نے موقع کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے کہا کہ "آپ مقطع پڑھ دیجیے" اور خلیل صاحب شور و غل کے درمیان مقطع پڑھ کر اپنی جگہ واپس آ گئے۔ اور اتنے دل برداشتہ ہوئے کہ تھوڑی دیر بعد اسٹیج سے اٹھ کر چلے گئے۔ دوسرے روز ملاقات ہوئی تو فخر صاحب پر بہت برہم تھے کہنے لگے۔ دیکھا رحمت تم نے کل رات فخر صاحب نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا۔ مجھے ((ONCE MORE)) مل رہا تھا۔ لوگ تالیاں بجا رہے تھے اور مجھے سننا چاہتے تھے (ONCE MORE) لیکن فخر صاحب کو میری کامیابی برداشت نہ ہوئی۔ اور مقطع پڑھنے کا حکم دے دیا۔ میں نے کہا چھوڑیے خلیل صاحب ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کو درگزر کر دینا چاہیے۔ آپ کا جو مقام اور مرتبہ ہے سب لوگ جانتے ہیں۔ لیکن میرے بہت سمجھانے پر بھی اس حادثہ کا اثر کافی دنوں تک ان پر قائم رہا۔

میں نے دل کے پھپھولے اسی لیے کہا ہے کہ بیچارے نئی داد اور بے داد سے

واقف نہ تھے اس واقعے کے لکھنے سے خلیل صاحب کی توہین یا تضحیک میرا مقصد قطعی نہیں ہے۔ ایسے لوگ احترام کے لائق ہوتے ہیں اور آج ایسی شرافت اور انکساری کے نمونے کہاں ملیں گے۔ خلیل صاحب کا انتقال غالباً ۱۹۵۵ء یا ۱۹۵۶ء میں ہوا۔

خلیلؔ مرحوم قبلہ احسنؔ مارہروی کے شاگرد تھے۔ بذریعہ خط و کتابت چند غزلوں پر احسنؔ مارہروی سے اصلاح لی۔ اس کے بعد احسنؔ صاحب کا انتقال ہوگیا۔ یہ بات مجھے خود خلیلؔ صاحب نے بتائی تھی۔ اس لیے خلیلؔ احمد آبادی کا سلسلہ داغ اسکول سے جا ملتا ہے۔ افسوس کہ سینکڑوں اشعار سُنے۔ مگر آج کوئی بھی شعر خلیل صاحب کا ذہن میں محفوظ نہیں ہے۔ صرف ایک شعر یاد آتا ہے۔ جو ہدیۂ ناظرین کرکے خلیل صاحب کے تعارف کو ختم کرتا ہے۔

انا الحق حق مگر منصور کو کہنے کا کیا حق تھا
سزا اس پر ملی کیوں بات منہ سے دون کی نکلی

لفظ "دون" داغ اسکول کی علامت ہے کہ اس طرح کی زبان و بیان کے محاورے داغ کے تلامذہ میں پائے جاتے ہیں۔

٭

حزیںؔ قریشی احمد آبادی

(پیدائش: ۱۹۱۲ء ——— وفات: ۱۹۸۰ء)

نام احمد حسین۔ تخلص حزیںؔ قریشی۔ وطن احمد آباد تاریخ پیدائش اور سنہ کا علم خود حزیںؔ صاحب کو بھی نہیں تھا۔ ان کے بقول ۱۹۱۲ء بھی ممکن ہے۔ وفات ۱۹۸۰ء ۱۷ را اپریل۔

شعری مجموعہ "بہشت خیال" ۱۹۶۸ء نعتیہ مجموعہ زیر ترتیب غیر مطبوعہ کلام محفوظ ہے۔ مدفون موسا سہاگ قبرستان شاہی باغ احمد آباد۔

احمد آباد جسے اردو کے اوّلین شاعر وَلی گجراتی کی سرزمین کہا جاتا ہے ایسے ایسے باکمال شعرا، ادبا اور فنکار دیے ہیں کہ جب بھی احمد آباد کی ادبی تاریخ قلمبند کی جائے گی تو ان لوگوں کا نام اور ادبی خدمات فراموش نہیں کی جا سکیں گی۔ ادب کے خاموش خدمت گزاروں میں حزیںؔ قریشی کا نام بھی ہے۔ جن کی ادبی خدمات پورے صوبے پر محیط ہیں۔ زبان و ادب کی خاموش خدمات کا سلسلہ بغیر کسی ستائش اور نام و نمود عمر کی آخری سانسوں تک جاری رہا۔ حزیںؔ مرحوم جتنے اچھے شاعر تھے اتنے ہی اچھے انسان بھی تھے۔ نیک سیرت وضع دار، با اخلاق اپنے ہم عصر شعرا کی قدر و منزلت اور اپنے سے کم عمر فنکاروں کی عزت افزائی میں بے انتہا فراخ دل ثابت ہوئے تھے۔

یہی وجہ ہے کہ عیب بینی سے نفرت کرتے تھے۔ موصوف نے گجرات کے ان علاقوں میں اردو کو عام کیا جہاں لوگ اپنی زبان سے ناواقف تھے۔ پٹلاد، سورت، سٹروچ، کلول، دوحد اور کھمبات تک مرحوم نے زبان و شاعری کو عام کیا۔ حزیںؔ صاحب سے میرے بہت ہی قریبی تعلقات تھے۔ اور اکثر ان سے شعر و شاعری

پر طویل گفتگو رہتی تھی۔ حالانکہ میری شاعری کی عمر ان کے مقابلے میں بہت مختصر ہے بلکہ ناپختہ اور ایک طالب علم کی سی ہے۔ تاہم جب بھی کوئی نئی غزل کہتے تھے، مجھے ضرور سناتے تھے اور کبھی کبھی تو یہاں تک کہہ دیا کرتے تھے کہ رحمت صاحب ذرا دھیان سے سنیے گا اگر کہیں کوئی سقم ہو گیا ہو تو اصلاح کر دینا۔ میرے منع کرنے کے باوجود بھی وہ اکثر یہ فقرہ دہرایا کرتے اور مجھے شرمندہ ہونا پڑتا تھا۔ اپنی تمام تر خداداد صلاحیتیں کے باوجود کبھی شہرت کی تمنا نہیں کی۔ بڑے مشاعروں میں شرکت نہیں کرتے تھے۔ نشستوں میں البتہ جایا کرتے تھے۔ کبھی کسی مشاعرے کی صدارت قبول نہیں کی۔ اگر کبھی بہت اصرار کیا تو برہم ہو جاتے اور ہم لوگ خاموش ہو جاتے۔ حزیں صاحب کی شاعری میں جو تازگی اور رکھ رکھاؤ تھا۔ وہ انھیں اور نمایاں کر سکتا تھا۔ مگر مزاج کی سادگی اور بردباری نے انھیں تمام ہنگامہ آرائیوں اور اپنی شخصیت کو نمایاں کرنے کی تمام کوششوں سے باز رکھا۔ کسی ادبی گروہ بندی یا سیاسی گٹھ جوڑ سے بہت دور تھے اور تعمیری کاموں پر یقین رکھتے تھے۔ ان کے بیشتر شاگرد اردو شعر و ادب کی علمی خدمات اسی طرح خاموشی سے کر رہے ہیں جو مرحوم کا خاصہ تھا۔ حزیں صاحب کی تعلیمی استعداد بہت معمولی تھی۔ اس کے باوجود شاعری کے تمام رموز و نکات سے واقف تھے۔ فن پر دستگاہ اور نگاہ باریک بیں تھی۔ انھوں نے کلاسیکی شعرا اور اساتذہ کا نہایت ہی عمیق مطالعہ کیا تھا۔ اور بعض اساتذہ کی صحبت سے مستفید بھی ہوئے تھے۔ مشاہدے اور تجربے کے عمل نے ان کی شاعری میں ایک تنوع بھی پیدا کر دیا تھا۔ حزیں قریشی کا تعلق داغ اسکول سے تھا۔ داغ کے مشہور شاگرد آغا شاعر دہلوی کے شاگرد عادل دہلوی سے شرف تلمذ تھا۔ اس کے باوجود علامہ سیماب اکبرآبادی کے پرستار اور مداح تھے اور علامہ کی بے پناہ قوت شعری سے متاثر، اعجاز صدیقی کی ادارت میں جس وقت "شاعر" آگرے سے شائع ہوتا تھا۔ اس وقت اس میں ہر ماہ طرحی مشاعرہ ہوتا تھا۔ حزیں صاحب بھی طرح پر غزل کہتے تھے اور شاعر کے اس ماہانہ سلسلے میں برابر شائع ہوتے رہے۔ پھر ان کی غزلیں شاعر اور دیگر ادبی جرائد میں نمایاں طور پر شائع ہونے لگیں۔ اسی طرح علمی اور ادبی حلقے میں مشہور و معروف ہونے لگے۔ اپنے ابتدائی دور میں ایک مرتبہ

احمد آباد کے ایک فی البدیہہ مشاعرے میں مدعو کیے گئے مصرعہ طرح تقسیم ہوا۔ اور مقررہ مدت کے اندر سب سے اچھے شعر جس نے کہے وہ حزیں صاحب تھے۔ نہایت ہی زود گو، مشکل پسند، اختراعی ذہن کے مالک تھے۔ نئی زمینوں کی تلاش اور نئے نئے قوافی اور ردیف کی تلاش وہ بھی اچھوتے مضامین کے ساتھ ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ عربی فارسی کی نامانوس اور نئی نئی تراکیب کا استعمال اتنی خوبصورتی سے کرتے تھے کہ جذبہ و فکر دونوں کا امتزاج شعر کی ترسیل میں مبہم نہیں ہوتا تھا۔ مشکل پسندی اور استادانہ رکھ رکھاؤ نے کتنے ہی بلند قامت شعرا کے یہاں ابہام کی فضا پیدا کر دی ہے۔ مگر حزیں صاحب کی شاعری میں کلاسیکی رچاؤ کے ساتھ عصری فضا اور آج کے مسائل کا اظہار بھی ملتا ہے۔ استادانہ ڈھنگ کی شاعری سے حزیں صاحب نے خود کو ہمیشہ بچائے رکھا الفاظ اور تراکیب میں اگر کوئی جدت ہے بھی تو تقلیدی ہی نہیں۔ تصوف کے رسیا مذہبی مزاج اور ماحول کے پروردہ دیندار شاعر کی شاعری میں جا بجا تصوف کے رنگ بکھرے ہوئے ہیں۔ عمر کے اس بہاؤ نے اس رنگ کو اس قدر نمایاں کیا کہ آخری عمر میں صرف نعتیں اور منقبتیں ہی کہنے لگے تھے۔ اس رنگ میں بھی مزاج وہی تھا۔ جو غزل میں برتا گیا تھا۔ نئی نئی زمینوں کی تلاش نئے نئے ردیف اور منفرد قوافی۔ اچھوتے خیالات۔ الفاظ و تراکیب میں تلاش جستجو کا عمل صرف عقیدت ہی نہیں یا صرف شاعری ہی نہیں بلکہ احساسات و جذبات کی سچائی اور عقیدت میں انفرادیت کا لحاظ بھی تھا۔ نعتوں اور منقبتوں کا اگر مجموعہ شائع کیا جائے تو یقیناً دو جلدوں میں سمائے گا۔ حزیں مرحوم کے صاحبزادے جو خود بھی شاعر ہیں۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ وہ والد مرحوم کا نعتیہ کلام ترتیب دے رہے ہیں۔ میرے خیال میں یہ بھی ہونا چاہیے کہ وہ شعری سرمایہ جو اب تک غیر مطبوعہ ہے مجموعہ کی شکل میں شائع ہو جائے۔ حزیں صاحب کی علمی و ادبی شعری خدمات کے اعتراف میں احمد آباد کے علمی و ادبی حلقے نیز قریشی برادری نے ۱۲ مئی ۱۹۷۶ء کو شاندار پیمانے پر جشن کا اہتمام کیا جسے مرحوم کے شاگرد جمال قریشی نے انتہائی محنت، دوڑ دھوپ، جانفشانی سے کامیاب بنایا۔ اور مرحوم کی خدمت میں کیسۂ زر بھی پیش کیا گیا۔ مرحوم بے شمار شاگردوں میں ان کے جانشین

جمالؔ قریشی ہیں۔ جس کا اظہار مرحوم نے انتقال سے قبل گلبن کو انٹرویو دیتے ہوئے کیا تھا۔

گجرات کی علمی و ادبی محفلوں سے ایک باکمال شاعر ایک اچھا انسان۔ ایک بزرگ رخصت ہوگیا جس کی کمی کا احساس مدتوں باقی رہے گا۔

نمونۂ کلام :

زمانہ تنقید کیا کرے گا کہ عارفِ حسنِ زندگی ہوں
عیوب پر بھی نگاہ کی ہے کمالِ ذوقِ ہنر سے پہلے

بغیر سوزِ محبت کے جل نہیں سکتا
چراغِ بزم ہو یا انجمن میں پروانہ

عجیب قدرت کی صنعتیں ہیں یہ پھول یہ آدمی یہ مٹی
بغور ہر چیز دیکھیے گا کہاں کہاں کام کی ہے مٹی

رات کی تنہائیوں میں جاگ تو میری طرح
سازِ دلبر گا کبھی نغمات ہو میری طرح

لباسِ ہستی میں جب نہیں تھی شعورِ گفتار بھی کہاں تھا
لباسِ ہستی میں جب سے آئی تو بات کرنے لگی ہے مٹی

حزیںؔ تلاشِ مضامین کروں فلک سے بھی دور
ملیں جو میرے تخیل کو جبرئیل کے پر

نعت و منقبت

رہِ طیبہ میں جب رکھا قدم لرزیدہ لرزیدہ
محبت آشنا دل ہوگیا نم دیدہ نم دیدہ

☆

کہیں ملی نہ دوامِ بہار کی سرخی
بیاضِ بلبل و گل کا ورق ورق دیکھا

میرا دل اس قدر مخمور ہے عشقِ محبت میں
کہ جیسے صبح دم غنچہ کوئی خوابیدہ خوابیدہ

☆

ایسے دن رات بھی کچھ منزلِ حق پر کاٹے
خشکیوں سے کبھی گزرے تو سمندر کاٹے

محو دل شاد ہیں تمہارات کے پچھلے پہر
مطمئن قلبِ حزیںؔ تمہارات کے پچھلے پہر

عزمِ راسخ کی قسم ذوقِ فراواں کی قسم
سختیاں عشق کی جھیلیں کبھی پتھر کاٹے

روح کی بیداریوں کو جانے تھی کس کی تلاش
جاں کہیں تھی دل کہیں تمہارات کے پچھلے پہر

اگرچہ نورِ تمنّا کی ہے کرن باریک
مگر نگاہِ بصیرت میں اس کی ہے تحریک

٭

خلافِ عشق یہ اٹھتی ہیں شورشیں کیا کیا
روش زمانہ کی پاتا ہوں مائلِ تضحیک

٭

فانی ہے حسنِ گل بھی وجودِ بہار بھی
کس شئے کا اس چمن میں بھروسا کرے کوئی

محمد نظیر نصیری

پورا نام محمد نظیر، نصیری تخلص، چشتیہ سلسلے میں شاہ نصیر الدین صاحب کے مرید، غالباً اسی وجہ سے نصیری تخلص اختیار کیا۔ شاعری میں شرفِ تلمذ کس سے حاصل تھا۔ اس کا پتہ نہیں چل سکا۔ وطن ضلع فیض آباد قصبہ گوشائیں گنج۔ ۱۹۲۰ء سے بہت قبل احمد آباد میں سکونت اختیار کی تمام عمر مل میں کام کیا۔ بیت المال احمد آباد کے جنرل سکریٹری مسلم لیگ اور انجمن ترقی اردو احمد آباد اور دیگر ادبی اداروں سے منسلک رہے۔

سر پر کالی مخمل کی ٹوپی۔ سفید کوٹ سفید پاجامہ ہاتھ میں چھتری۔ پان کے بہت شوقین۔ گرمی ہو یا برسات اسی وضع قطع کے ساتھ ہمیشہ بسر کی۔ کبھی کبھی کاندھے پر رومال بھی ڈال لیا کرتے تھے۔ اردو، فارسی، عربی زبانوں پر عبور، شعر اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں کہتے تھے۔ مشاعروں میں اکثر تحت اللفظ پڑھتے۔ فنِ عروض پر دسترس۔ اساتذۂ فارسی کے سینکڑوں اشعار ازبر۔ تقریر کے مردِ میدان سیاسی، مذہبی، ادبی غرض کوئی اجتماع ہو بے تکان بولتے تھے۔ اور بات بات میں لطائف بولتے ہر مکتبِ خیال کے لوگ نصیری صاحب کو بلاتے تھے اور لطف اندوز ہوتے تھے۔ بوڑھوں میں بوڑھے بچوں میں بچے اور جوانوں کی محفل میں جوان، یہ تھے نصیری صاحب ہمیشہ ہنستے اور خوش مزاج رہنا ان کا معمول تھا۔ میں نے مشکل سے مشکل حالات میں بھی نصیری صاحب کو کبیدہ خاطر نہیں دیکھا۔ عمرِ طویل پائی میں نے ان کو کبھی سائیکل یا رکشا پر سفر کرتے نہیں دیکھا۔ ہر جگہ پیدل ہی جاتے تھے۔ بہت مجبوری میں بس میں سفر کرتے تھے۔ زندہ دل اتنے کہ مشاعروں کی جان، مشاعروں

منحوس تھا باون کا سن میرے لیے" اور یہ مصرعہ اسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتا تھا نصیری صاحب بہت ہی خوبیوں کے مالک تھے اور باغ و بہار آدمی تھے۔ ایسے لوگوں کی یاد آج بھی آتی ہے اور دل کو ستاتی ہے۔ نصیری صاحب کے دو اشعار پیش خدمت ہے۔

ہے نصیری کا مکاں کیسے کہاں اے غالب
کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد

*

مخاطب ہو کے اردو کہہ رہی ہے یہ مخالف سے
انھیں بتیس دانتوں میں رہوں گی میں زباں ہو کر

کامل عاشقی احمد آبادی

(پیدائش: سن ۱۸۹۹ء وفات سن ۱۹۶۸ء)

کامل صاحب کا مجموعہ کلام جو ان کے انتقال کے بعد شائع ہوا۔ اس میں نہ کہیں ان کی تاریخ پیدائش کا ذکر ہے اور نہ وفات کا، انتقال غالباً ۱۹۶۷ء یا ۱۹۶۸ء میں ہوا۔ ایک تنگ و تاریک کوٹھری میں عمر کا بیشتر حصہ گزرا دریاپور پوسٹ آفس کے پاس اس کوٹھری میں کامل صاحب سکونت پذیر رہے۔ صوفی منش زندگی اختیار کی۔ دنیا داری سے اکثر بے تعلق۔ شاعری اور اللہ کی عبادت میں تمام عمر گذاری، پنجگانہ نمازی، سفید قمیض تہبند اور کبھی پاجامہ، یہ مختصر لباس تھا۔ اس کوٹھری سے باہر کبھی میں نے نکلتے نہیں دیکھا۔ مشاعروں کے دعوت نامے ملتے تھے۔ مشاعرہ طرحی ہو یا غیر طرحی اپنا کلام ایک شخص راگیش کی معرفت بھیجتے تھے۔ اور وہی اس کو مشاعرے میں پڑھتے بھی تھے۔ کامل صاحب کی شہر کے سبھی لوگ عزت کرتے تھے۔ مشاعروں میں ان کا کلام بہت شوق سے سنا جاتا تھا۔ ایک مرتبہ کچھ لوگوں نے کامل صاحب کے مکان کے قریب بلکہ ان کی کوٹھری کے دروازے کے قریب اسٹیج بنا کر مشاعرے کا اہتمام کیا۔ اور اس امید پر کہ کامل صاحب شرکت کریں گے۔ لوگوں کے کافی اصرار پر بھی کامل صاحب نے مشاعرے میں شرکت نہیں کی۔ صرف دروازے کے قریب بیٹھ کر مشاعرہ سنتے رہے۔ زندگی میں باقاعدگی اور ان کا اپنا ایک اصول مرتے دم تک قائم رہا۔ لوگوں سے ملنے کے اوقات مقرر تھے۔ وقت مقررہ پر حجرہ نما کوٹھری کا دروازہ کھلتا تھا اور لوگ ملاقات کے لیے آتے تھے۔ شعرا، احباب، عقیدت مند کچھ قوال جو غزلوں کی فرمائش کرتے۔ لوگوں کو معلوم تھا کہ کامل صاحب فلاں وقت اپنے مکان کا دروازہ کھولتے

ہیں اور لوگوں سے ملاقات کرتے ہیں۔ یہ اُن کا اصول تھا۔ صبح سویرے اُٹھنا، نماز کے بعد تلاوتِ کلام پاک پھر ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہوکر دوپہر بارہ یا ایک بجے تک لوگوں سے ملاقات کیا کرتے تھے۔ اس کے بعد رات کو عشاء کی نماز کے بعد تقریباً گیارہ بجے تک یہ سلسلہ رہتا تھا کبھی کبھی باہر سے آنے والے شعرا بھی ان کے اوقات کی پابندی کا لحاظ کیا کرتے تھے۔ طویل مدت تک بیٹھے رہنے کی وجہ سے ٹانگوں میں کچھ تکلیف محسوس کرنے لگے تو ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ اس طرح آپ کی ٹانگوں کی قوت جاتی رہے گی۔ آپ اپنے کمرے میں کچھ وقت چہل قدمی کیا کریں۔ اور اس کے بعد کامل صاحب نے اپنے معمول میں اسے بھی شامل کرلیا۔ کامل صاحب عاشق احمدآبادی کے شاگرد تھے۔ اس لیے اپنے نام کے آگے عاشقی لکھتے تھے۔ اس زمانے کے مشہور شعرا ان کے یہاں اکثر آتے تھے۔ جن میں زخمی دہلوی، محمد نظیر نصیری، راز صدیقی، مرزا کوثر بیگ کے علاوہ میں بھی اکثر شام کو یا رات کے وقت کامل صاحب سے ملاقات کرتا تھا۔ اور ان کی صاف ستھری شاعری سے بہت متاثر تھا۔ اکثر کچھ کتابیں یا رسالے ان کے مطالعے کے لیے لے جایا کرتا تھا صرف اس لیے کہ انھیں شعرا کا کلام دیکھنے کا موقع ملے اور ادب کی رفتار کا اندازہ رہے۔ کامل صاحب نئی کتب اور رسائل بڑی توجہ سے پڑھتے تھے اور اکثر پسندیدہ اشعار پر نشاندہی کردیا کرتے تھے۔ بہت سے رسالے یا کتابیں ایک ساتھ قبول نہیں کیا کرتے تھے۔ نظم، گیت، غزل، قطعات اور کبھی کبھی آزاد نظم کی بھی طبع آزمائی کرتے تھے۔ کامل صاحب نے اگر باہر کی دنیا میں قدم رکھا ہوتا اور اپنے کلام کو اخبارات و رسائل میں اشاعت کے لیے بھیجا ہوتا تو ان کا کلام بھی ہندستان کے مشہور معروف شعرا میں شامل ہوتا۔ کامل صاحب کے کچھ شاگرد بھی ہیں۔ کافی لوگوں نے فیض اُٹھایا ہے۔

انتخاب کلام :

ہوگئی نہ سرطور لغزش
آدمی کوئی ہو آدمی ہے

☆

شاعری اور شہادت میں کوئی فرق نہیں
خون دونوں ہی جگہ سُرخیِ افسانہ ہے

☆

لحد کو دیکھ کر کامل مجھے حیرت سی ہوتی ہے
کہ اک اتنی بڑی دُنیا کا اتنا تنگ دروازہ

☆

زیست کی اور شرح کیا ہوتی
پنجۂ یاس میں سسکتی آس

قطعہ

اپنے بوسیدہ مکاں کی چھت کے سُوراخوں سے جب
دوپہر کو چھن کے آتی ہیں شعاعیں مہر کی
جمع کرلیتا ہوں ان کو ایک بیاضِ شعر میں
پس یہی بنتی ہوئی لرزش ہے میری شاعری

٭

موت اور دل جلوں کے گھر کامل
اللہ اللہ نزاکتِ احساس
ترے شہیدِ وفا مار کر جلائے گئے
حیات شرط جو ٹھہری تو کیا گریز و مفر
حیات و موت کی اتنی ہی شرح کافی ہے
سکون کی بات جُدا دھڑکنوں کی شان دگر
میں اس گماں سے اُلجھتا رہا ہوں شام و سحر
ہے یہ جہاں مری منزل کہ صرف راہ گذر
بھری بہار میں توبہ کا توڑنا اے دل
برا ہے کام مگر ہوسکے تو دیر نہ کر

غزل

منجدھار سے اُٹھ کر ساحل تک ایک موج ہوا میں آ ئےگی
ساحل کے نظارہ بازوں کو طوفاں میں بہائے جائیگی
یہ حسن وضیا کی تابانی ایک دھوپ ہے اس پہ ناز نہ کر
جو صبح کو چڑھتی جاتی ہے وہ شام کو ڈھلتی جائے گی
یوں مجھ کو مٹا کر اے دنیا مسرور نہ ہو دل شاد نہ ہو
تو بھی ہے فنا کے چکر میں تو بھی مرے پیچھے آ ئےگی
وہ صحن چمن میں اے ہمدم کچھ دیر جہاں رُک جائینگے
واں کوئی شگوفہ پھولے گا یا کوئی کلی مرجھائے گی
نادار سہی لیکن کامل خود دار طبیعت رکھتا ہوں
میں خود ہی اسے ٹھکرا دوں گا، دنیا مجھے کیا ٹھکرائےگی

وحید بنارسی

(پیدائش: ۱۹۰۱ء ——— وفات: ۱۹۶۵ء)

نام غالباً وحیدالدین یا وحید احمد ہوگا۔ لیکن وحید بنارسی کے نام سے مشہور تھے۔ وطن بھی بنارس ہی ہوگا۔ احمد آباد میں محلہ جمال پور میں رہتے تھے۔ پوری زندگی کپڑا مل میں کام کیا۔ آخری ایام میں طبیعت زیادہ خراب ہوگئی تھی۔ تقریباً دو سال تک صاحب فراش رہے۔ احمد آباد ہی میں انتقال ہوا۔ انتقال ایسی حالت میں ہوا کہ کسی کو پتہ بھی نہ چل سکا۔ شہر سے باہر شاہ عالم سے قریب اپنے لڑکے کے یہاں بیماری کے ایام میں منتقل ہوگئے تھے۔ احمد آباد کے اتنے بڑے شاعر کے جنازے میں صرف چند لوگ شریک تھے اور ایسا کئی بڑے شعرا کے ساتھ ہوا ہے۔ تقریباً ایک ہفتہ بعد لوگوں کو معلوم ہوا کہ وحید بنارسی اب اس دنیا سے رخصت ہوگئے ہیں۔ وحید بنارسی کس کے شاگرد تھے اور کب پیدا ہوئے۔ اس کا اب کچھ پتہ نہیں چلتا۔ مرحوم کا مجموعہ کلام نہ زندگی میں چھپا نہ مرنے کے بعد۔ اور وہ کلام کس کے پاس محفوظ ہے اس کا بھی پتہ نہیں۔ اور نہ اب شاید پتا چلے۔ محمد حسین آزاد اپنے استاد ذوق کے دیوان کو غدر کے زمانے میں اپنے سینہ سے لگا کر اور اپنی زندگی کا بہترین سرمایہ سمجھ کر دہلی سے نہ نکلتے تو آج ذوق کا نام بھی حالات کی گرد میں دب جاتا اور کوئی جاننے والا نہ ہوتا۔

وحید بنارسی پستہ قد، گندمی رنگ کے آدمی تھے، ہمیشہ کرتا و پاجامہ زیب تن کرتے تھے۔ خوش اخلاق و ملنسار ترقی پسند تحریک اور کمیونسٹ پارٹی سے منسلک کامریڈ وحید بنارسی کے نام سے مشہور، مشاعروں کی جان پڑھنے کا انداز نہایت دلکش سجاد ظہیر نے اپنی کتاب "روشنائی" میں احمد آباد کے مشاعرے اور وحید بنارسی

ذکر بطور خاص کیا ہے۔ شاعری میں ایک خاص مطمحِ نظر رکھتے تھے۔ مزدوروں کے ہمدرد اور غمگسار۔ ان کے مسائل سے متعلق غزلیں اور نظمیں کہنا اور مزدوروں کے اجتماع میں پڑھنا۔ ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ میں نے ایسا بے باک اور نڈر شاعر خاص طور سے احمدآباد میں تو نہیں دیکھا۔ اور اس کے لیے کئی بار انھیں جیل بھی جانا پڑا۔ اس زمانے میں احمدآباد میں اساتذہ کی اچھی خاصی تعداد تھی۔ فخرِ گجرات، حزیں قریشی، انجم فوقی بدایونی، بشیر احمد خاں زخمی دہلوی، محمد نظیر نصیری، کلیم احمدآبادی، جمیل کلیمی اور انہی ایام میں جناب ادیب مالیگانوی کا بھی کچھ عرصہ احمدآباد میں قیام رہا۔ ایک مرتبہ انجم فوقی بدایونی نے مشاعرہ میں ایک قطعہ پڑھا۔ اس کے آخری دو مصرعے کچھ اس طرح سے تھے۔

بلا سے ڈوب جائے نبضِ فطرت
میں اپنی رَو میں بہنا چاہتا ہوں

یہ سُنتے ہی وحید بنارسی سے برداشت نہ ہو سکا اور فوراً ہی ایک فی البدیہہ قطعہ کہہ کر پڑھ ڈالا۔

خوشی سے رنج سہنا چاہتا ہوں
مگر اک بات کہنا چاہتا ہوں
بلا سے تو رہے تنہا جہاں میں
میں سب کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں

اس قطعہ کے لکھنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ وحید بنارسی کو مزدور تحریک اور مزدوروں کے مسائل سے گہری دلچسپی تھی اور سرمایہ دارانہ نظام سے بیداری کا جذبہ کس قدر شدید تھا۔ میں نے گزشتہ کسی تعارف میں احمدآباد کے ایک فی البدیہہ مشاعرے کا ذکر کیا ہے۔ وحید بنارسی بھی اس مشاعرے میں شریک تھے۔ کافی اشعار بھی کہے تھے وحید بنارسی کی سب سے بڑی خوبی یہ بھی کہ کتنا ہی بڑا مشاعرہ ہو اور سامعین ہوٹنگ پر اتر آئے ہوں اور مجمع کسی طرح بھی قابو میں نہ آرہا ہو۔ اس وقت اگر وحید بنارسی کے نام کا اعلان کر دیا جائے تو وہ فوراً بے چون وچرا دوڑ کر مائک پر آجاتے اور دیکھتے ہی دیکھتے مشاعرے کا نقشہ بدل جاتا۔ میں نے یہ عالم کئی مرتبہ اپنی آنکھوں سے دیکھا

ہے اور کبھی تو ایسا بھی ہوا ہے کہ لوگ شور مچا رہے ہیں اور کسی شاعر کو سننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اس وقت وحید بنارسی بغیر کسی اعلان کے خود ہی مائک پر آجاتے اور عوام اپنے چہیتے اور پیارے شاعر کو سُننے کے لیے ہمہ تن گوش ہو جاتے اور پھر مشاعرہ اس کے بعد پُرسکون حالت میں چلتا۔ وحید بنارسی اشعار بہت صاف ستھری اور عام فہم زبان میں کہتے تھے جو لوگوں کے دلوں میں اُتر جاتے تھے اور وحید بنارسی کو داد و تحسین سے نوازا جاتا تھا۔ افسوس کہ آج ایسی ہستیاں ہم میں نہ رہیں نہ وہ مشاعرے رہے نہ وہ پُرانے آداب۔ وحید بنارسی کا کلام بھی دوسرے شعرا کی طرح زمانے کی گرد میں دب جائے گا۔ میں نے انتہائی کوشش کی کہ کچھ اشعار دستیاب ہو جائیں۔ تاکہ ہدیۂ ناظرین کر سکوں۔ مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مجھے اس میں ناکامی ملی۔ یہ چند سطریں ہی محفوظ ہو جائیں تو غنیمت ہے تاکہ آنے والے مورخ کو گجرات کے مشہور شعرا کے سلسلہ میں کم سے کم نام تو مل جائیں۔

عربی فارسی بھاشا کی دوکاں ہے اردو
ہند کے واسطے موزوں یہ زباں ہے اردو
اس کو گر دینی ترقی ہے تو میدان میں آؤ
ورنہ پھر ہند سے بے نام و نشاں ہے اردو

(عیسیٰ خاں نشتر)

مرحوم نے ایک کل ہند مشاعرے کا بھی اہتمام کیا تھا جس میں اس وقت کے کئی مشاہیر شعرا نے شرکت کی تھی۔ غالباً حسرت موہانی بھی اس مشاعرے میں شریک تھے۔ یہ مشاعرہ ہٹی سنگھ کی واڑی میں ہوا تھا۔ اور کافی دنوں تک اس مشاعرہ کا چرچا رہا۔

عاشق جونپوری

عاشق جونپوری احمد آباد کب آئے اور انتقال کب ہوا۔ اس سلسلے میں صحیح معلومات نہیں ملتی ہیں اور نہ یہ پتا چلتا ہے کہ عاشق جونپوری کا سلسلۂ تلمذ کیا ہے۔ میں نے پہلی مرتبہ غالباً ان کو سنہ ۱۹۵۰ء میں مشاعرے میں سُنا۔ اس وقت ان کی عمر تقریباً ساٹھ سال کے قریب ہوگی۔ فخرِ گجرات کلیم احمد آبادی اور زخمی دہلوی کے ہمعصر تھے۔ سفید داڑھی، کھدر کی قمیض، کھدر کا پائجامہ، سر پر دو پلّی سفید ٹوپی، کبھی جواہر کٹ اور کبھی کوٹ پہن لیا کرتے تھے۔ پان کے بہت شوقین، ہمیشہ پان سے ہونٹ لال رہتے تھے کبھی کبھی پان کے کچھ چھینٹے سفید داڑھی پر نظر آتے تھے۔ جو بہت بھلے لگتے تھے۔ یہ تھے عاشق جونپوری۔

تحت میں پڑھنے کا انداز بہت خوبصورت، احمد آباد کا کوئی بھی مشاعرہ جس میں عاشق صاحب کو دعوت ہو۔ ان کی شرکت ضرور ہوتی تھی۔ زبان پر زبردست قدرت حاصل تھی۔ مشاعرہ اگر طرحی ہے تو عاشق صاحب طرح میں غزل کہتے تھے۔ میں نے کئی بار ان کو طرحی مشاعرہ میں سُنا ہے۔ سنہ ۱۹۵۰ء کے بعد میری شاعری کی ابتدا تھی۔ میں اساتذہ کا کلام بہت غور سے سُنتا تھا۔ عاشق صاحب کے پڑھنے کا انداز۔ زبان و بیان کی شگفتگی نے مجھے متاثر کیا۔ ان کے اشعار سننے سے اندازہ ہوتا تھا کہ عاشق صاحب کو اردو کے ساتھ فارسی زبان پر بھی دسترس حاصل تھی۔ ہر چند کہ ان کی شاعری روایتی تھی۔ مگر زبردست پختگی انداز بیان خوبصورت پڑھنے کا والہانہ انداز ان کو اپنے ہمعصر شعرا میں ممتاز کرتا تھا۔

غالباً ۱۹۵۵ء ہی کی بات ہے کہ مرزاپور میں جناب زاغ ٹونکی نے ایک مشاعرہ کا اہتمام کیا۔ مصرعۂ طرح تھا ع :

یہ وہ جگہ ہے کہ جس کی فضا خراب نہیں

اس وقت کے تمام استاد شعرا اس مشاعرے میں شریک تھے۔ اس زمین اور ردیف قافیہ میں تمام پرانے شعرا کی غزلیں ملتی ہیں۔ نہایت ہی پامال زمین میں اچھے شعر کہنا جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔ خاص طور پر جواب کے قافیہ کو تو اساتذہ نے اس بری طرح استعمال کیا تھا کہ اب اس قافیہ میں کوئی نیا مضمون لانے کی گنجائش ہی نہ تھی۔ عاشق جونپوری نے اس مشاعرے میں سب سے عمدہ طرحی غزل پیش کی جس کا ایک شعر ذہن میں محفوظ رہ گیا ہے۔

جواب خط ہے شکستہ پڑھا نہیں جاتا
نوشتۂ خط تقدیر ہے، جواب نہیں

غرض اس کے بعد بارہا عاشق صاحب کو ملنے کا اتفاق ہوا۔ نہایت ہی منکسر المزاج۔ طبیعت بہت سادہ پائی تھی۔ اگر انھیں اگلے وقتوں کی شرافت کا نمونہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ زندگی بہت عسرت میں بسر کی۔ صبح سویرے اٹھ کر بسکٹ کا ٹوکرا سر پر رکھ کر گھر سے نکلتے اور سارنگ پورٹیل کے پاس آ کر بیٹھ جاتے یہی روز کا معمول تھا اور یہی ذریعہ معاش اسی میں صبر و شکر کرتے اور خوش و خرم رہتے گاندھی جی کا قتل اسی زمانے میں ہوا تھا اور بہت دنوں تک گاندھی قتل اور ناتھورام کے متعلق نظمیں پڑھی جاتی رہیں۔ عاشق جونپوری نے گاندھی جی کے قتل کے متعلق ایک نظم کہی اور ناتھورام گوڈسے کو ہدف ملامت بنایا۔ نظم بہت خوبصورت تھی کافی مقبول ہوئی۔ پوری نظم میں زبان و بیان کی شگفتگی نمایاں تھی۔ صرف ٹیپ کے دو مصرعے اس وقت ذہن میں محفوظ ہیں۔ ان دونوں مصرعوں سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ نظم کتنی خوبصورت ہوگی اور عاشق صاحب کو زبان و بیان پر کتنی قدرت حاصل ہوگی۔

قتل گاندھی کا کیا اور ابھی زندہ تو ہے
تجھ پہ سو بار اے ناتھو تھو ہے

افسوس آج کوئی یہ بتانے والا نہیں ہے کہ ان کا سرمایۂ شاعری کس کے پاس محفوظ ہے یا گردش زمانہ کے ہاتھوں خورد برد ہو گیا ہے۔ اور ان کے کون کون شاگرد رہے۔ اور نہ آج کسی کو ان کا کوئی شعر یاد ہے۔ اور کچھ دنوں کے بعد تو نہ کوئی ایسا شخص رہے گا جو عاشق صاحب کے نام سے واقف ہو۔ اپنے وقت کے استاد کے لیے اگر یہ چند سطریں بھی محفوظ ہو گئیں تو میں سمجھوں گا کہ میری محنت رائیگاں نہیں گئی۔

ع : " زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے "

خداداد خاں وحشی

(پیدائش: سنہ ۱۹۰۰ء ——— وفات سنہ ۱۹۶۹ء)

سنہ ۱۹۴۷ء سے قبل جن شعرا کو امتیازی حیثیت حاصل تھی اور ان کا اپنا ایک مقام و مرتبہ تھا۔ ان میں جناب وحشی صاحب کا نام بھی شامل تھا۔ وحشی صاحب احمد آباد کب آئے اس سلسلے میں وثوق سے نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن انتقال احمد آباد ہی میں ہوا۔ ابتدا میں وحشی صاحب نے مل میں کام کیا۔ بعد میں سارنگی کا مدار الیسوسی ایشن میں غالباً سکریٹری کے عہدے پر کافی عرصے تک کام کیا۔ لوگوں سے سُنا ہے کہ وحشی صاحب فخر گجرات کے شاگرد تھے۔ لیکن علم مطالعہ اردو فارسی، عربی کی تعلیم اچھی تھی اور چونکہ نسلاً پٹھان بھی تھے۔ اس لیے کبھی کبھی اپنے استاد سے بھی بھڑ جایا کرتے تھے۔ بڑی موری کا پاجامہ اور جناح کیپ یہ ان کا مستقل لباس تھا۔ کبھی کبھی کوٹ بھی پہن لیا کرتے تھے۔ میں نے کئی مشاعروں میں ان کو سُنا ہے تحت میں پڑھنے کا انتہائی دلکش انداز تھا۔ کلام اور انداز بیان سے سامعین کے دلوں پر تاثر چھوڑتے تھے۔ ان کے شاگرد جناب عظمت متھرادی سے معلوم ہوا کہ وہ اپنا کلام کبھی یکجا کر کے نہیں رکھتے تھے۔ طبیعت بہت لاابالی تھی مسلم لیگ سے بھی وابستہ تھے۔ تقریر بہت عمدہ کرتے تھے۔ کئی لوگوں سے ان کے کلام کے بارے میں معلوم کیا۔ مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ چند اشعار عظمت متھرادی کی وساطت سے حاصل ہوئے جو ان کے حافظے میں محفوظ تھے ہدیۂ ناظرین کر رہا ہوں اگر یہ اشعار نہ ملے ہوتے تو معاملہ صفر ہی تھا۔ نہ جانے احمد آباد کی کتنی قابل قدر ہستیاں ہوں گی۔ جن کے حالات فراہم کرنے والا اب کوئی نہیں۔ بہر حال میری یہ کوشش ہے جن کے متعلق جو کچھ ملے ماہنامہ گلبن کے ذریعہ محفوظ ہو جائے۔ ہر چند میں اس کام کا اہل نہیں ہوں لیکن گلبن کے ایڈیٹر ظفر ہاشمی صاحب کا شکر گزار ہوں کہ وہ مجھ جیسے آدمی سے

حقیر آدمی سے ایک نیک اور بامقصد کام لے رہے ہیں۔ شاید مستقبل کے کسی تذکرہ نویس کو ان مختصر تحریروں سے مدد ملے۔

نمونۂ کلام:

کون ہوں کیسے بتاؤں میں یہ آسانی کے ساتھ
آئینہ خانہ میں بیٹھا ہوں میں حیرانی کے ساتھ

جہاں میں ہر طرف پھیلی ہوئی چنگیز خانی ہے
خداوندا یہ قذاقی ترے افلاک کے نیچے

کچھ اس انداز سے ظالم نے میرا حال دل پوچھا
ارادہ مسکرا دینے کا تھا آنسو نکل آئے
نہ تھی عرض شکست دل گوارہ اہل محفل کو
بھری محفل سے اُٹھ کر درد کے مارے نکل آئے

عشق پابند وفا ہے نہ کہ پابند رسوم
سر جھکانے کو نہیں کہتے ہیں سجدہ کرنا

یا تو دیوانہ ہنسے یا وہ جسے توفیق دے
ورنہ اس دنیا میں رہ کر مسکرا سکتا ہے کون

☆☆

عادل دہلوی

عادل دہلوی احمد آباد کب آئے۔ اس کا کچھ علم نہیں۔ اور نہ آج احمد آباد میں کوئی ایسا شخص ہے جو اس سلسلے میں کچھ بتا سکے۔ میری شاعری کا ابتدائی زمانہ تھا۔ غالباً ۱۹۴۷ء یا ۱۹۴۸ء تھا کہ میں نے ان کو مشاعروں میں اُستادانہ حیثیت سے شامل ہوتے دیکھا۔ لباس میں ہمیشہ کُرتا اور تہبند زیب تن کرتے تھے۔ سر پر گول سفید کپڑے کی ٹوپی جو اونچی باڑ کی ہوتی تھی۔ سفید لمبی داڑھی۔ آغا شاعر قزلباش دہلوی ہی کے شاگرد تھے۔ عادل صاحب کی شاعری زبان کی شاعری ہوتی تھی۔ داغ دہلوی کی زبان کو صحیح معنوں میں اگر کسی نے اپنایا تھا تو وہ تھے آغا شاعر دہلوی، اس لیے عادل دہلوی کے یہاں بھی اس کی جھلک ملتی تھی۔ مشاعروں میں ضرور شرکت کرتے تھے۔ مشاعرہ طرحی ہو یا غیر طرحی عادل صاحب کی شرکت ضرور ہوتی تھی۔ ویسے اس زمانے میں طرحی مشاعروں کا رواج تھا۔ عادل صاحب مزاج کے بہت تیز تھے اور بیخود دہلوی کی طرح ان کی بھی گالیاں مشہور تھیں۔ ان کی عمر کے اکثر احباب اُن سے گالیاں سُن کر لُطف لیتے تھے۔ برسرِ مشاعرہ ان کے احباب نے کوئی جملہ کس دیا۔ بس بپھر گیا تھا۔ غزل سنانی بند، اور مائک پر ہی گالیوں کی بوچھار شروع ہو جاتی اور احباب لُطف لیتے۔

اجمیر کے قریب بیاور راجستھان میں ان کے کچھ عزیز رہتے تھے۔ بیاور جا رہے تھے۔ راستے میں دہلی ہی میں اُن کا انتقال ہو گیا۔ اور اس کے بعد کسی کو پتہ نہیں چلا پہنچ پائے یا راستے ہی میں کسی مقام پر اُن کو دفن کر دیا گیا۔ صرف اتنی اطلاع ملی کہ عادل دہلوی کا بیاور جاتے ہوئے راستے میں انتقال ہو گیا۔ کئی لوگوں سے دریافت

کیا۔ جن سے توقع تھی کہ ان کو ضرور عادل صاحب کے کچھ اشعار یاد ہوں گے۔ نتیجہ صفر رہا۔ ایک دو شعر سے زیادہ کچھ نہیں مِل سکا۔ عادل صاحب اپنے وقت کے اُستاد اور شعرا میں بہت عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔

نمونۂ کلام :

قطعہ

ساقیا تو نے مری بادہ پرستی دیکھی
خود بخود جام چھلکنے لگے مستی دیکھی
جھک کے چل دہر میں عادل یہ صفت پیدا کر
اچھے اچھوں نے اُبھر کر یہاں پستی دیکھی

☆

مرزا کوثر بیگ

پانچواں کنواں نئی مہلت میں رہتے تھے۔ اُستادانہ حیثیت کے حامل بہت زود گو، رسائل میں اکثر اپنا کلام چھپواتے رہتے تھے۔ شیروانی ہمیشہ زیب تن کیا کرتے تھے۔ ڈھیلی موری کا سفید پاجامہ، سر پر جناح کیپ مرتے دم تک اسی وضع قطع پر قائم رہے۔ فخر گجرات کے شاگرد تھے۔ اکثر اپنے نام کے ساتھ فخری لکھتے تھے فخر گجرات کے انتقال کے بعد جانشین فخر گجرات کہلائے۔ لیکن حقیقت ہے کہ شاعری علم اور فن عروض کی واقفیت میں کسی طرح بھی فخر گجرات سے کم نہیں تھے۔ کبھی کبھی ادبی معاملات میں فخر گجرات یعنی اپنے اُستاد سے بھڑ جایا کرتے تھے۔ اور اپنی بات پر بضد رہتے تھے۔ دل لکھنوی نوح ناروی احسن مارہروی سے بھی اپنے کلام پر اصلاح لی ہے۔ اس کا ذکر مجھ سے خود مرزا صاحب نے کیا۔ بلکہ ایک مرتبہ تو یہ کہ کر غزل سنائی کہ یہ غزل دو اُستادوں کی دیکھی ہوئی ہے۔ یعنی پہلے غزل نوح ناروی کو بھیجی اور وہی غزل جب اصلاح ہو کر آئی تو دل شاہجہانپوری کو بھیج دی۔

مزاج کے بہت تیز تھے۔ ادبی معرکوں میں لطف لیتے تھے۔ اور اس کھوج میں لگے رہتے تھے کہ کون کس سے اصلاح لیتا ہے اور کون کس کو لکھ کر دیتا ہے۔ اس طرح کا ایک واقعہ خود مرزا صاحب نے راقم الحروف سے بیان کیا۔

میں نے پہلے بھی کہیں ذکر کیا ہے کہ پہلے طرحی مشاعروں کا بہت رواج تھا اور طرحی مشاعرے ہی ہوا کرتے تھے۔ ہر ماہ کہیں نہ کہیں طرحی مشاعرہ تھا۔

ضرور ہوتا تھا۔ طرحی مشاعرے کا اعلان ایک ماہ قبل ہی ہو جایا کرتا تھا۔ اس وقت احمد آباد میں علامہ سیماب اکبر آبادی کا حلقہ کافی وسیع تھا۔ سیماب صاحب بقید حیات تھے۔ یہ بات مشہور ہو گئی تھی کہ یہاں کے کچھ شعرا سیماب صاحب سے طرحی غزلیں منگواتے ہیں۔ چنانچہ مرزا صاحب نے کچھ دے دلا کر اُس حلقے کے پوسٹ مین کو رضامند کر لیا کہ ان لوگوں کے نام کے خطوط جو اس ہفتے میں آئیں وہ مجھے دے دینا۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا اور اُنھیں شعرا نے مشاعرے میں شرکت نہیں کی۔ بعد میں وہ خطوط پوسٹ مین کو دے دیے گئے اور وہ غزلیں اپنی جگہ پہنچا دی گئیں اس طرح مرزا صاحب نے اس بات کا پتہ چلا لیا کہ کون شاعر سیماب صاحب سے مکمل غزلیں منگاتے ہیں اور کتنے لوگ اصلاح لیتے ہیں۔ مرزا صاحب تھے بھی ویسے لڑاکو مزاج کے آدمی۔ غزل، نظم، قصیدہ، رباعی۔ ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ اپنی غزلیں نظمیں اخبار اور رسائل میں اشاعت کے لیے بھیجتے رہتے تھے جبکہ ان کے ہم عصر شعرا اس طرف سے لاپرواہی برتتے تھے۔ مرزا صاحب کی اردو فارسی کی تعلیم اچھی تھی مگر عام بات چیت میں گجراتی لب و لہجہ شامل رہتا تھا۔ دوران گفتگو تھوڑی تھوڑی دیر میں لفظ "کیا" کا استعمال کثرت سے کرتے تھے۔ اور چٹکی میں نسوار (چھینکنی) رہتی تھی۔ جسے تھوڑی تھوڑی دیر میں سونگھتے رہتے تھے۔ شعرا کو کم ہی خاطر میں لاتے تھے۔ مشاعروں میں داد دینے میں بہت بخیل ہمیشہ تنقید کرنا اور نقائص پر نظر رکھنا عادت میں شمار تھا۔ مجموعہ کلام شائع نہیں ہوا اور نہ اب شائع ہونے کی توقع ہے۔ ایک غزل گجراتی محاورے کے ساتھ کہی جو مقبول ہوئی۔ گجراتی میں ایک لفظ "چھچھوبا الفتح" "کیا ہوا" کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ مرزا نے اس لفظ کو اردو ردیف کے ساتھ فٹ کیا ہے۔ یعنی قافیہ فن سخن اور ردیف "بگڑا تو چھو بگڑا" اور مقطع میں اس بات کا اعتراف اس طرح کیا ہے۔

"زبان احمد آبادی میں مرزا نے غزل کہہ دی
اگر اُستاد فن کہتے ہیں فن بگڑا تو چھو بگڑا

اور یہ شعر اس غزل کا ہے جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے کہ مرزا صاحب نے اپنی ایک غزل نوح ناروی اور دل لکھنوی کو دکھلائی تھی۔

نہیں ہیں سنگ و آہن میرے آب و گل میں پیوستہ
نہیں سمجھو زمین کے دوش پر بارِ گراں مجھ کو

ضیا ناگوری

ضیا ناگور کے رہنے والے تھے۔ احمد آباد کب آئے۔ اس سلسلے میں کچھ پتا نہیں چلتا ہے۔ غالباً ۱۹۵۰ء میں احمد آباد ہی میں انتقال کیا۔ ڈھیلی موری کا سفید پاجامہ سفید قمیص سر پر ململ کی ٹوپی خوبصورت اور گورے رنگ کے آدمی تھے۔ چھوٹی سی سفید داڑھی راقم الحروف نے جب ان کو دیکھا۔ اس وقت کافی عمر تھی۔ ضعیف ہو چکے تھے۔ مشاعرے کی دعوت پر شرکت کر لیتے تھے۔ عجز و انکسار کا نمونہ نہایت شریف اور مہذب آدمی فخر گجرات فخر احمد آبادی کے استاد فخر گجرات نے اردو فارسی کی تعلیم اُن ہی سے حاصل کی تھی۔ احمد آباد محلہ ناگوری واڑ میں رہتے تھے۔ کافی تلاش کے بعد معلوم ہوا کہ اب ان کے بچے وغیرہ کوئی یہاں نہیں رہتے ہیں۔ سب ناگور چلے گئے ہیں کئی لوگوں کے ذریعے کوشش کی کہ اُن کا کلام یا بیاض حاصل ہو جائے۔ مگر نتیجہ صفر رہا۔ اور سب چیزیں ضائع ہو گئی ہیں۔ تحت اللفظ پڑھتے تھے۔ بہت ٹھہر ٹھہر کر آہستہ آہستہ مجھے صرف دو ایک مرتبہ اُن کو دیکھنے اور سننے کا موقع ملا۔ جناب غلام نبی ناگوری کو ان کا ایک شعر یاد تھا۔ جو میں ہدیہ ناظرین کر رہا ہوں۔

یہ زلف رُخِ یار پہ لہرائی ہوئی ہے
یا حسن کے گلشن میں گھٹا چھائی ہوئی ہے

☆

منشی نسیم احمد صدیقی کامل امروہوی

(پیدائش: ۱۹۰۱ء ——— وفات: ۱۹۸۵ء)

کامل صاحب ۱۹۴۷ء سے بہت پہلے احمد آباد آ گئے۔ جمال پور میں رہتے تھے۔ پرائمری اردو اسکول میں ٹیچر تھے۔ شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ شاگرد کس کے تھے اس کے متعلق علم نہیں۔ احمد آباد میں اس وقت فخر گجرات کلیم احمد آبادی، زخمی دہلوی، انجم بدایونی یہاں کے استاد شعرا تھے کامل صاحب نے بہت جلد ان استاد شعرا کی صف میں اپنی جگہ بنالی اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک نمایاں مقام حاصل کرلیا۔ اس وقت بھی استاد شعرا میں گروپ بندی تھی۔ بڑے بڑے معرکے ہوتے فی البدیہہ مشاعرے ہوتے۔ عروض و فن پر جھگڑے ہوتے۔ لیکن تمام لوگ کامل صاحب کی کہی ہوئی بات کو مستند مانتے تھے۔ کامل صاحب کو فن عروض پر زبردست دسترس حاصل تھی۔ فارسی کے زبردست عالم اس زمانے میں پرائمری اسکول میں نوکری حاصل کرنے کے لیے مڈل پاس ہونا ضروری تھا۔ اگر ادیب منشی کامل کی سند ہے تو اس کی بھی بہت اہمیت تھی۔ میٹرک پاس ہونا کوئی ضروری نہیں تھا۔ کامل صاحب میٹرک پاس نہیں تھے۔ پھر بھی اردو فارسی پر اس قدر عبور دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ آج ایم۔ اے اور بی۔ اے کی سند لے کر ٹیچرس پرائمری اسکول میں آتے ہیں۔ لیکن ان کی خود کی قابلیت صفر جیسی ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اردو پرائمری اسکولوں کا معیار تعلیم بہت گرا ہوا ہے۔ اس لیے ہم توقع نہیں کرسکتے کہ نئی نسل سے کوئی شاعر یا ادیب ابھر کر میدان میں آئے گا۔

کامل امروہوی کو میں نے دو مرتبہ مشاعرے میں سُنا کلام ترنم سے پڑھتے تھے مکان پر شام کو شعرا اکٹھا ہوتے تھے جن میں وحید بنارسی، زخمی دہلوی، انجم فوقی

بدایونی کے علاوہ اور دوسرے شعرا بھی ہوتے تھے۔ ادب پر گفتگو ہوتی تھی شعر و شاعری کا چرچا ہوتا تھا۔ کبھی کبھی میں بھی حاضر ہوتا اور خاموشی کے ساتھ بزرگوں کی گفتگو سنتا۔

جگر مرادآبادی کو مشاعرے میں کامل صاحب نے ہی بلایا تھا اور اس مشاعرے کا انعقاد بھی انھوں نے ہی کیا تھا۔ انجم بدایونی پاکستان چلے گئے زخمی فخر اور کلیم صاحب کا انتقال ہوگیا۔ کامل امروہوی نے مشاعروں میں آنا ترک کردیا۔ اکثر شکایت کرتے تھے کہ ایک ایک کرکے تمام ساتھی بچھڑ گئے۔ اب کس کے پاس جایا جائے، کس سے گفتگو کریں۔ گزرے ہوئے زمانے کی یاد کرکے اکثر آنکھوں میں آنسو آجایا کرتے تھے۔ گھر سے بہت کم نکلتے تھے۔

میرے دوست حسین الدین صدیقی جو احمد آباد ریڈیو اسٹیشن پر ہیں ایک بہت شکستہ فارسی کی بہت پرانی کتاب لے کر آئے۔ جو سنگیت سے متعلق تھی پڑھنا بھی دشوار تھا وہ چاہتے تھے کہ اس کا اردو ترجمہ ہوجائے۔ یہاں پر کئی فارسی داں حضرات کو دکھائی مگر بات کچھ بنی نہیں۔ ایک روز مجھ سے ذکر کیا کہ اس کتاب کے ترجمے میں بہت مشکل ہورہی ہے کوئی ایسا آدمی نہیں مل رہا ہے کہ جو میری رہبری کرے۔ فوراً میری نظر کامل امروہوی پر پڑی۔ میں نے حسین الدین صدیقی سے کہا کہ ایک شخص کے پاس چلتے ہیں ممکن ہے وہ رضامند ہوجائے اور آپ کا کام کرے۔ چنانچہ ایک روز میں نے ان سے مل کر مدعا ظاہر کیا۔ اسی سال کی عمر سانس کا مرض پھر بھی کہنے لگے کہ میں دیکھ لوں اس کے بعد بتاؤں گا دو تین روز کے بعد صدیقی کو لے کر گیا۔ ان دنوں سانس کا زور زیادہ تھا۔ پھر بھی میری خاطر کتاب دیکھی۔ تھوڑی دیر میں ایک صفحہ کا ترجمہ پڑھ کر حسین الدین کو سُنا دیا۔ وہ مطمئن ہوگئے اور خوش ہوئے کہ اب میرا کام ہوجائے گا۔ نسیم صاحب نے صدیقی سے کہا کہ آپ اس کام میں عجلت نہ کریں۔ میری طبیعت ٹھیک ہونے پر میں آپ کا کام آہستہ آہستہ کردوں گا البتہ موسیقی کی اصطلاحیں جو اس میں درج ہیں ان کے درست ہونے کی ذمہ داری میری نہیں ہے باقی دوسرا تمام کام ذمہ دارانہ حیثیت سے ہوگا اور یہی ہوا بھی دو ماہ کے اندر کتاب کا ترجمہ کرکے صدیقی صاحب کے حوالے کیا۔ آج کے پرائمری اسکول کے

کیے جاتے رہتے۔ ایک مرتبہ انجمن ترقی پسند مصنفین کا مشاعرہ ہو رہا تھا۔ لاؤڈ اسپیکر کی پرمٹ رات کے گیارہ بجے تک کی تھی جیسا کہ عام طور پر ہوتی ہے۔ بارہ بجے رات کو مشاعرہ پورے شباب پر تھا کہ چند پولس والے آ گئے اور پرمٹ طلب کیا۔ ہم لوگوں نے پرمٹ دکھلایا۔ کہنے لگے آپ کے پاس رات کے گیارہ بجے تک کا پرمٹ ہے۔ اور اب بارہ بج رہے ہیں اس لیے لاؤڈ اسپیکر بند کر دیجیے۔ ورنہ ہم لوگ رپورٹ کریں گے۔ میں نے کامریڈ زوار حسین سے کہا کہ ان لوگوں کو پانچ روپے دے دیجیے یہ لوگ چلے جائیں گے خواہ مخواہ رپورٹ کے چکر میں پڑنا اور کورٹ میں جا کر جرمانہ ادا کرنا۔ وقت بھی خراب ہوگا اور پریشانی بھی اس پر زوار حسین نے کہا کہ ہم لوگ پندرہ روپے جرمانہ ادا کر دیں گے۔ لیکن ان لوگوں کو پانچ روپے نہیں دیں گے۔ اس کے بعد پولس والوں سے مخاطب ہو کر کہنے لگے کہ آپ لوگ اپنا کام کریں۔ مشاعرہ کامیاب رہا۔ رات کو تین بجے تک چلا۔ جرمانہ ادا کر دیا گیا۔ اسی طرح کا ایک اور واقعہ ہوا جس سے زوار حسین کتنے اصول پسند تھے اس پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ بھی انجمن ہی کا مشاعرہ تھا تمام شعرا بمبئی سے آ رہے تھے۔ اس زمانے میں بمبئی سے احمد آباد کا کرایہ دس روپے تھا۔ طے اس طرح ہوا تھا کہ کرایے کے علاوہ سفر خرچ ہر شاعر کو پانچ روپیہ دیا جائے گا۔ کل ملا کر ہر شاعر کو پچیس روپے دیے جائیں گے۔ انجمن کا ہر فیصلہ شعرا منظور کرتے تھے۔ آنے والے شعرا میں سردار جعفری، مجروح سلطانپوری، کیفی اعظمی، ظفر گورکھپوری کے علاوہ ساحر لدھیانوی اور دیگر شعرا بھی شامل تھے۔ اس وقت مظفر شاہجہانپوری نئے نئے بمبئی میں وارد ہوئے تھے۔ ہم لوگ بھی واقف نہیں تھے۔ چنانچہ سردار جعفری نے زوار حسین کو خط لکھا کہ میں نے مشاعرے میں ایک بہت اچھے شاعر کو دعوت دی ہے ان کا نام اور پتا بھیج رہا ہوں ایک شاعر کا اضافہ کر لیجیے۔ آپ یقیناً خوش ہوں گے۔ میں انھیں اپنے ساتھ لا رہا ہوں۔ مظفر صاحب کو دعوت نامہ دیا گیا۔ مظفر شاہجہانپوری نے مشاعرے میں شرکت کی منظوری بھیج دی اور ساتھ ہی ایک خط لکھا کہ میں مزدور آدمی ہوں۔ یہاں پر ایک اخبار میں ملازم ہوں، یومیہ سات روپے ملتے ہیں۔ احمد آباد آنے میں میرا دو روز کا نقصان ہوگا۔ اگر انجمن کرایے کے علاوہ صرف پندرہ روپے کا اضافہ کر دے تو مہربانی ہوگی۔ یہ خط انجمن کی مشاعرہ کمیٹی کی میٹنگ میں پڑھا گیا۔

زوار حسین مشاعرے کے کنوینر بھی تھے۔ مشاعرہ کمیٹی اس بات پر متفق تھی کہ مظفر صاحب کو پندرہ روپے دے دیے جائیں۔ مگر زوار صاحب اپنی بات پر اڑے رہے کہ اگر آپ مظفر صاحب کے لیے پندرہ روپے منظور کرتے ہیں تو ہر ایک آنے والے شاعر کے لیے پندرہ روپے منظور کیجیے۔ اس بات پر کافی بحث ہوئی۔ آخر کار سردار جعفری کو لکھ دیا گیا کہ پندرہ روپیہ زائد کمیٹی منظور نہیں کرتی ہے۔ آپ مظفر شاہجہانپوری کو انکار کر دیجیے۔ مشاعرہ ہوا۔ بہت کامیاب رہا۔ مظفر شاہجہانپوری بھی آئے اور وہی اس مشاعرے کے سب سے کامیاب شاعر بھی رہے۔ سردار جعفری نے انھیں اپنی جیب سے پندرہ روپے دینے کا وعدہ کیا۔ زوار حسین احمد مل کی نوکری چھوڑ کر اپنے وطن چلے گئے وہیں جنوری ۱۹۸۵ء میں دل کا دورہ پڑا اور ایک صاف گو اور نڈر بیباک پارٹی کا سپاہی اس دنیا سے کوچ کر گیا۔

نمونہ کلام :

مخلص نہ ہو تو صاحب عرفاں نہیں کہتے
بیگانۂ حیات کو انساں نہیں کہتے
دل میں نہ اتر جائے جو ہر لفظ اذاں کا
تو ایسے موذن کو خوش الحاں نہیں کہتے
گلزار سے بارود کی بو آتی ہے احمر
صحرا کو مگر حشر بداماں نہیں کہتے

☆

قمر احمد آبادی

قمر صاحب عادل دہلوی کے شاگرد تھے آخر میں لباس وغیرہ بھی عادل دہلوی کی طرح زیب تن کرتے تھے سر پر کپڑے کی اونچی دیوار والی ٹوپی کرتا اور تہبند قمر صاحب کے یہاں عادل دہلوی کی طرح زبان دانی تو نہیں تھی مگر تھے بہت زود گو۔ مشکل قافیے اور مشکل ردیف میں مشکل سے مشکل زمین پسند کر کے شعر کہتے تھے انداز روایتی تھا۔ شعر بہت محنت سے کہتے تھے۔ قمر صاحب کے کئی شاگرد بھی ہیں مشاعروں میں ضرور شرکت کرتے تھے۔ اپنے لباس اور کلام کے اعتبار سے نمایاں رہتے تھے۔ بہت خوش مزاج اور ملنسار انسان راقم الحروف سے جب بھی ملتے بہت خوش ہوتے ابھی چند سال قبل ہی انتقال ہوا ہے کوئی مجموعہ کلام شائع نہیں ہوا اور نہ ہی اب کوئی شائع شدہ غزل ملتی ہے۔ کلام کے متعلق بھی وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ محفوظ بھی ہے کہ نہیں۔

خیال قریشی

سارنگ پور پل کے نیچے گوشت کی دکان کرتے تھے۔ بہت ملنسار و خوش اخلاق خوبصورت، لمبا قد، چوڑی پیشانی، پڑھنے کا انداز بھی بہت ہی خوبصورت، مشاعروں میں شیروانی اور ڈھیلی موری کا پاجامہ پہن کر شرکت کرتے تھے۔ میں نے دیکھا کہ ایک نوجوان خوبصورت لڑکا ترنم کے ساتھ بہت ہی اعتماد سے اپنی غزل مشاعروں میں پڑھتا ہے۔ ۱۹۴۵ء سے پچاس تک یہ شاعر مشاعروں میں شرکت کرتا رہا۔ اس کے بعد اچانک مشاعروں سے غائب کسی نے جاننے کی کوشش نہیں کی کہ یہ شاعر ایک دم کیوں روپوش ہو گیا اور نہ ہی میں نے اس کے متعلق سوچا۔ جوانی اور ہنگاموں کا زمانہ تھا۔ سب اپنی اپنی دھن میں مگن رہتے تھے۔ دس سال کے طویل عرصے کے بعد ایک روز میں خاص بازار سے گذر رہا تھا کہ الف کی مسجد کے پاس ایک بچہ دوڑتا ہوا آیا۔ مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا آپ کو بلا رہے ہیں اور انگلی سے ایک سمت اشارہ کیا، وہاں سامنے مجھے حیرت اور تعجب ہوا۔ وہاں سامنے مجھے میرا شناسا کوئی نظر نہ آیا۔ پھر بھی میں اس بچے کے ساتھ چلنے لگا۔ قریب جا کر دیکھا کہ ایک شخص دوزانو بیٹھا ہے گردن دونوں گھٹنوں کے درمیان جھکی ہوئی ہے۔ اس شخص نے بیٹھے بیٹھے پلکوں کو قدرے اونچا کیا اور آہستہ سے مسکراتے ہوئے کہا۔ رحمت صاحب سلام علیکم اب میں نے غور سے اس چہرے کو پہچاننے کی کوشش کی ...... یہ خیال قریشی تھے۔ پورے جسم پر

فالج کا اثر اُٹھنے بیٹھنے سے معذور گردن دونوں بازوؤں کے درمیان دھنس گئی تھی۔ سر بھی اُٹھا نہیں سکتے تھے۔ اپنے ہاتھ سے کھا بھی نہیں سکتے تھے۔ دوسروں کے رحم و کرم پر چلنے والے خیال قریشی۔ میں نے خیال قرشی کو دیکھ کر یہ سب کچھ اندازہ لگایا۔ اس کے بعد مزید معلومات کر کے خیال قرشی کو تکلیف پہنچانے کی کوشش نہیں کی۔ اور پھر میرا معمول ہو گیا کہ جب بھی میں ادھر سے گزرتا۔ کچھ وقت خیال کے پاس ضرور گذارتا۔ ایسے عالم میں بھی خیال شعر کہتے تھے۔ کئی مرتبہ خیال نے اپنے اشعار سُنائے۔ مولانا حبیب الرحمٰن غزنوی بھی کبھی کبھی خیال کے پاس آجاتے۔ اور ان کا کلام لے کر اپنے ماہنامے آب حیات میں چھاپتے تھے۔ کچھ سال اس طرح گذارنے کے بعد خیال قرشی اس دُنیا سے چل بسے اور کسی کو بھی پتہ نہ چل سکا کہ خیال قرشی کا کب انتقال ہوا۔

رونق جونپوری (پیدائش: ۱۹۳۵ء وفات: ۱۹۷۰ء)

چھوٹی عمر میں ہی احمد آباد آگئے تھے۔ مل میں کام کرتے تھے۔ مع اہل و عیال سارنگ پور پُل کے نیچے کسی چال میں رہتے تھے۔ زندگی عُسرت میں بسر کی۔ اکثر بیمار رہتے تھے۔ اُن کے پڑھنے کا انداز بہت ہی دلکش تھا۔ مشاعروں میں جب وہ اپنے گیت ترنم سے پڑھتے تھے تو مشاعرہ لُوٹ لیا کرتے تھے۔ اکثر گیت ہی پڑھتے تھے اور خاص طور سے عوام ان سے گیت ہی کی فرمائش کیا کرتے تھے۔ ان کا ایک گیت مشہور رہا۔ جسے مشاعروں میں لوگ خاص طور سے فرمائش کرکے پڑھواتے تھے۔ کبھی کبھی غزل بھی کہتے تھے۔ مگر غزل میں اتنے مقبول نہیں ہوئے تھے فن سخن کے رموز و نکات سے زیادہ واقفیت نہیں تھی۔ اس لیے مقبولیت صرف مشاعروں کی حد تک تھی۔ ان کے انتقال کے بعد جونپور والوں نے ان کے بیوی بچوں کے لیے ایک مشاعرہ کیا۔ جس میں کچھ رقم بچا کر ان کے بیوی بچوں کے حوالے کر دی گئی۔

بیکل جونپوری

بزرگ آدمی تھے۔ پوربی زبان میں شاعری کرتے تھے۔ گیت اور نظمیں کہتے تھے۔ اس زبان کے احمد آباد میں واحد شاعر تھے۔ جونپور پرتاپ گڑھ کے علاقے میں ایک صنف کجری بہت مشہور ہے جو اکثر پوربی زبان میں ہوتی ہے بیکل صاحب کجری کے اُستاد شاعر تھے وہ اپنے کلام میں سرمایہ داروں کو خاص نشانہ بناتے تھے۔ کمیونسٹ خیالات کے حامی، احمد آباد میں سب لوگ بیکل صاحب کی عزت کیا کرتے تھے۔ مشاعروں میں پسند کیے جاتے تھے۔ پُرانی وضع کا لباس پہنتے تھے۔ سفید دھوتی قمیض اور سر پر کالی ٹوپی پہنتے تھے۔ احمد آباد میں کجری والوں کا ایک بہت بڑا حلقہ ان کی بہت عزت کرتا تھا۔ ان کی کہی ہوئی کجریاں گاتے تھے۔ اور اُن کو اُستاد مانتے تھے۔ بیکل صاحب نے بھی آخر عمر میں احمد آباد چھوڑ دیا تھا۔ اور اپنے وطن جونپور میں انتقال کیا۔ میں نے اکثر کجری کے پروگراموں میں شرکت کی ہے۔ یہ بالکل چاربیت کی طرح ہوتا ہے۔ کلام میں اُستاد شعرا کافی محنت کرتے ہیں۔ بہت لُطف اندوز ہونے کے لائق پروگرام ہوتا ہے۔ پورب کے علاقے میں آج بھی اس کا رواج ہے، احمد آباد میں اب یہ برائے نام ہو کر رہ گیا ہے۔

تاج ٹونکی (پیدائش: ۱۹۳۱ء – وفات: ۱۹۶۶ء)

تاج کا تعلق ٹونک سے تھا۔ یہ بھی چھوٹی عمر میں احمد آباد آگئے۔ مل میں کام کرنا شروع کیا۔ آخر وقت تک مل ہی میں کام کرتے رہے۔ جوانی میں انتقال ہوا۔ تمام جسم میں کینسر کے پھوڑے نمودار ہو گئے، اور یہ سب کچھ ایک دم ہوا۔ صرف ایک ہفتے کے اندر اس دُنیا سے کوچ کر گئے۔ اگر زندگی نے وفا کی ہوتی تو تاج کا شمار آج احمد آباد کے اچھے شعرا میں ہوتا تاج بہت ذہین آدمی تھے۔ بہت سوچ سمجھ کر شعر کہتے تھے۔ تاج نے تھوڑے ہی دنوں میں ایک نمایاں مقام حاصل کر لیا تھا۔ بہت مخلص اور ملنسار آدمی تھے۔ آخر وقت میں

کچھ قوالوں نے انھیں اپنے نرغے میں لے لیا۔ اور تاآج سے اپنے مطلب کا کلام لکھواتے رہتے تھے۔

کامل جونپوری

ترقی پسند خیالات کے حامل انجمن ترقی پسندی مصنفین سے وابستہ کئی شعرا کامل صاحب سے فیض سخن حاصل کیا کرتے تھے۔ مل کی نوکری چھوڑنے کے بعد اپنے وطن جونپور چلے گئے۔ اور وہیں پر انتقال ہوا۔ راقم الحروف سے اچھے مراسم تھے۔ کامل کا کوئی مجموعہ کلام شائع نہیں ہوا۔ ان کے بچے آج بھی احمد آباد میں مقیم ہیں۔ اُن کے کلام کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ سب ضائع ہوگیا ہو۔

شاطر اصلاحی

فائم گنج کے رہنے والے تھے۔ مل میں کام کرتے تھے۔ ریٹائرڈ ہونے کے بعد وطن چلے گئے۔ وہیں انتقال ہوا۔ بہت زود گو استاد شاعر، کتنے ہی لوگوں کو اصلاح دیتے تھے۔ بیس پچیس شعر سے کم کی غزل کبھی نہیں کہتے تھے۔ تمام کے تمام اشعار مشاعرے میں پڑھتے تھے۔ پڑھنے کا انداز کچھ اچھا نہیں تھا۔ اس پر طویل غزل اس لیے مشاعرے میں کوئی خاص تاثر نہیں چھوڑ پاتے تھے۔ اُن کو ہمارے حلقے کے تمام لوگ استاد کہتے تھے۔ کئی مرتبہ دوستوں نے کہا بھی کہ استاد آپ اگر اشعار کا انتخاب کر لیا کرو تو آپ مشاعرے میں کامیاب رہو۔ نیز غزلیں بھی معیاری کہلائیں۔ اس بات پر شاطر صاحب برہم ہو جایا کرتے تھے۔ میں تو جتنا کہتا ہوں سب ہی پڑھوں گا اور سب ہی بیاض میں لکھ لیتا ہوں۔ افسوس آج اُن کا کلام بھی محفوظ نہیں ہے۔ اور نہ ہی بچوں میں ادبی ذوق ہے کہ جو اپنے والد کے ادبی سرمائے کا خیال کر کے سنبھال کر رکھتے۔

جوہر احمد آبادی

دریاپور چار واٹ بخاری محلے میں رہتے تھے بہت معمولی تعلیم، حافظہ زبردست کتنے ہی شعرا کی غزلیں اور اشعار یاد رکھتے تھے نام عبدالکریم تھا۔ مل میں کام کرتے تھے مشاعروں میں ضرور شرکت کرتے تھے۔ داد دینے کا اپنا ایک مخصوص انداز تھا۔ مشاعرے میں بیٹھتے تو مشاعرے میں گرمی پیدا کر دیتے۔ قوالوں کے بہت دیوانے ڈھونڈ ڈھونڈ کر اچھی غزلیں قوالوں کو دیتے محفلوں میں شرکت کرتے کالوپور ٹاور رات کو روزانہ بیٹھتے مشاعروں میں ضرور شرکت کرتے اور آخر وقت تک بیٹھتے، ایک قطعہ اکثر مشاعروں میں پڑھتے، یہی چند سال قبل انتقال ہوا۔

محمود مائل

وطن بھوپال چھوٹی عمر میں احمد آباد آ گئے تھے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین سے وابستہ رہے۔ بہت ذہین شاعر انجمن سے وابستہ کتنے ہی ساتھیوں کو شاعری کی طرف مائل کیا جو آگے چل کر اچھے شعر کہنے لگے تھے۔ دوستوں کے شعر سُن کر ان کو مشورے دے کر بہت خوش ہوتے تھے۔ اشعر نوری اور قمر نوری انھیں کے مشوروں سے بہت اچھے شعر کہنے لگے تھے۔ عزیز جاوید جو بمبئی جاکر مرزا عزیز جاوید کے نام سے مشہور ہوئے۔ اور مجموعۂ کلام بھی شائع ہوا۔ اس میں محمود مائل کی محنت کا خاص دخل تھا۔ مائل احمد آباد چھوڑ کر بمبئی چلے گئے۔ وہاں سے پھر بھیونڈی چلے گئے۔ وہاں فیکٹری میں سانچے چلا کر بسر اوقات کرتے رہے۔ ہمیشہ پریشانی اور عسرت میں زندگی بسر کی۔ اپنی طرف سے بہت لاپرواہ اور لاأبالی انسان تھے۔ ابھی کچھ سال پہلے بھیونڈی میں انتقال ہوا۔ شعر بہت اچھے اور سوچ سمجھ کر کہتے تھے۔ زود گو بھی بہت تھے۔ اپنا کلام کبھی کبھی رسائل میں بھیجتے تھے۔ بعد میں یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ کوئی مجموعہ کلام شائع نہیں ہوا۔

خیالؔ قریشی

مجھ کو مبہم جو یاد آتے ہیں   آگ دل میں وہی لگاتے ہیں
لوگ دنیا میں اے خیالؔ اکثر   اپنی ہستی کو بھول جاتے ہیں

٭

راز و نیاز باہم سمجھے گا کیا زمانہ
ہم اُن سے اور وہ ہم سے ملتے ہیں غائبانہ

تاجؔ ٹونکی:

ہم کیا سوئیں کیا نیند آئے
کب تک غم کی شام ڈھلے

رونقؔ جونپوری:-

مانا ہر ایک درد کا درماں ہے آج کل
پھر کیوں حیات سر بہ گریباں ہے آج کل
جنت نشاں جو خاک تھی وہ لالہ زار ہے
ارزاں یہاں پہ خونِ شہیداں ہے آج کل
کیوں تار تار دامنِ انسانیت نہ ہو
انسان خود ہی دشمنِ انساں ہے آجکل

کاملؔ جونپوری:

مرے کاروانِ حیات آفریں کی
خدا جانے منزل بھی ہے یا نہیں ہے
چلا چل تو جاری ہے برسوں سے لیکن
چلا تھا جہاں سے ابھی تک وہیں ہے

بیکلؔ جونپوری:

بھوک کی آگ میں جلتا کے جلاوت بائین
اور لوگن کو تو کمبل و تلیا بانٹت
ہم کو پوشاک نہ چھپر یہ گٹھریا یا بانٹت
بھوک کی آگ میں جلتا کے جلاوت بائین

خنجرِ ظلم تو بڑھتا ہی چلا جاتا ہے
خونِ مظلوم نکلتا ہی چلا جاتا ہے
ہم نہ بدلے ہیں نہ بدلی ہے ہماری حالت
رنگِ اغیار بدلتا ہی چلا جاتا ہے

مائلؔ بھوپالی:

اُن سے ملنے کی یہ سیج وجہ ہے تو دیکھیں مائلؔ
آج وہ آپ سے ملتے ہیں کہ ہم سے پہلے
کعبہ جاؤ تو پکڑ لیتے ہیں خوبانِ جمیل
بمبئی راہ میں آتی ہے حرم سے پہلے

جوہرؔ احمد آبادی:

اے خواب سے ہم کنار ہونے والے
اے قیمتی اوقات کے کھونے والے
اُٹھ جاگ حقیقت کے اُجالوں کی قسم
باطل کا لحاف اوڑھ کے سونے والے

قمرؔ احمد آبادی:

ڈوب اے مہرِ تلاطم تو اس انداز سے ڈوب
بڑھ کے خود ساحلِ دریا تری تعظیم کرے
آبروِ گلشنِ اُلفت میں ہو ایسی تیری
بھول چاہے تجھے کانٹا تری تعظیم کرے

٭

شاطر اصلاحی

نمونۂ کلام

تم آکے تصوّر میں اک بار خدارا
کہدو میں تمھارا ہوں تمھارا ہوں تمھارا

کچھ شے تو پسِ پردہ یقیناً نظر آئی
معلوم نہیں برقِ اجل تھی یا شرارا

سینے میں مچلنے لگی معصوم تمنا
یہ کس نے مجھے پردۂ ہستی سے پکارا

ہر سمت سے آواز یہی آتی ہے شاطر
اس قحط زدہ ہند میں مشکل ہے گزارا

جو پھر سے بزمِ محبت سجائی جاتی ہے
کسی کے آنے کی اُمید پائی جاتی ہے
کسی حسین کی آنکھوں میں دیکھ کر آنسو
نثار ہونے کو ساری خدائی جاتی ہے
ہم اپنا ہوش بھی کھو دیں گے آج اے شاطر
کہیں بڑھا کے محبت گھٹائی جاتی ہے

Phone
6290

ٹیلیفون
۶۲۹۰

انجمن ترقی اردو (ہند)

Anjuman-e-Taraqqi-e-Urdu (India)

1, Daryaganj, Delhi.

اسمٰعیل گنج، دہلی
معرفت ... خلیق منزل - محلہ جوڑی والان

۲۹ - اکتوبر

مکرمی - کل شام میں علی گڑھ سے واپس آیا تو آپ کا خط ملا۔ مجھے یہ معلوم کر کے دلی مسرت ہوئی کہ پہلی اور دوسری نومبر کو احمد آباد میں انجمن مصنفین ترقی ہند کی سرپرستی میں بہت بڑی کانفرنس ہونے والی ہے۔ گزشتہ سال اپریل میں اردو کانفرنس ہوئی تھی جو تقسیم ملک کے بعد پہلی اردو کانفرنس تھی۔ اس کے بعد جولائی میں ایک دوسری کانفرنس ہوئی۔ اب یہ تیسری کانفرنس ہوگی۔ احمد آباد اردو کی اس قدر شناسی پر قابل صد مبارکباد ہے۔ احمد آباد آج نہیں کئی صدی سے اردو کا گھر اور مرکز رہا ہے۔ اس نے اردو کی ابتدائی نشو و نما میں جو قابل قدر اور ممتاز کام کیا ہے وہ اردو ادب کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ مجھے امید ہے کہ اس زمانے میں بھی جبکہ بعض جماعتیں ناسمجھی سے اردو کی مخالفت پر کمربستہ نظر آتی ہیں۔ احمد آباد اپنی پرزور تحریک اور حمایت سے اردو زبان و ادب کی ترقی میں ہمیشہ پیش پیش رہے گا۔ میں اس کانفرنس کی کامیابی کے لیے دعا کرتا ہوں۔

[illegible]

محترمی تسلیم

[illegible]

گجرات کے ادیب و شعرا کی مطبوعات

کتاب کا نام	مصنف	سنِ اشاعت	مکتبہ، پبلشر، ناشر
۱۔ ایک آواز	خلش بڑودوی	۱۹۸۲ء	موڈرن پبلشنگ ہاؤس دہلی
۲۔ قطارِ شیشہ	خلش بڑودوی	۱۹۶۵ء	بزمِ توفیق بڑودہ
۳۔ سنگ و گل	قیوم کنول فتحپوری	۱۹۷۹ء	گمکا شاہ عالم احمدآباد
۴۔ سورج کے تماشائی۔ پانچ شعرا کا کلام		۱۹۷۴ء	بزمِ توفیق بڑودہ
۵۔ سخنورانِ گجرات	ڈاکٹر سید ظہیرالدین مدنی	۱۹۸۱ء	ترقی اردو بیورو، نئی دہلی
۶۔ شعرائے گجرات	اے۔ ایم۔ شعلہ	۱۹۸۳ء	اے۔ ایم۔ شعلہ دودھیشور روڈ احمدآباد
۷۔ صوت و صدا	وقار واثقی	۱۹۸۱ء	رضوان احمد صدیقی احمدآباد
۸۔ کفِ سیلاب	وقار واثقی	۱۹۷۲ء	آج پریس بمبئی نمبر۹
۹۔ متاعِ کلیم	کلیم احمدآبادی	۱۹۵۸ء	کلیم بکڈپو خاص بازار احمدآباد
۱۰۔ بہشتِ خیال	حزیں قریشی	۱۹۶۸ء	جمال منزل جمال پور چکلہ، احمدآباد
۱۱۔ لفظوں کا سفر	جمیل کلیمی	۱۹۷۳ء	کلیم بکڈپو خاص بازار، احمدآباد
۱۲۔ اضافہ	رحمت امروہوی	۱۹۸۳ء	مکتبہ دین و ادب لکھنؤ
۱۳۔ ترجبین	رحمت امروہوی	۱۹۸۵ء	مکتبہ دین و ادب لکھنؤ
۱۴۔ نفی	رشید افروز	۱۹۸۰ء	ماورا پبلشر علی گڈھ
۱۵۔ جمالِ کربلا	جمال قریشی	۱۹۶۲ء	جمال منزل، جمالپور چکلہ احمدآباد
۱۶۔ تاریخِ صوفیائے گجرات	ڈاکٹر ظہورالحسن شارق	۱۹۸۱ء	جمیل اکیڈمی خاص بازار احمدآباد

۱۷۔ انتخاب ولی	ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی	۱۹۸۳ء	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی
۱۸۔ صدائے کامل	کامل احمد آبادی	۱۹۷۰ء	یونیورسل آرٹ لیتھو پریس بمبئی
۱۹۔ جھنجھناہٹ	مظہر فخری سنبھلی	۱۹۷۳ء	اعلیٰ پریس دہلی
۲۰۔ کیفیات شاغل	شاغل نظامی کلولوی	۱۹۷۴ء	مشورہ کنواں کلول ضلع مہسانہ گجرات
۲۱۔ تیسری کتاب	محمد علوی	۱۹۷۸ء	شعور پبلی کیشنز دہلی
۲۲۔ خالی مکان	محمد علوی	۱۹۶۳ء	محمود ایاز شاہکار الہ آباد
۲۳۔ آخری دن کی تلاش	محمد علوی	۱۹۶۸ء	شب خون کتاب گھر الہ آباد
۲۴۔ آب رواں	بسمل پرتاب گڈھی	۱۹۸۴ء	ایڈوانس کلچرل اینڈ سوشل گروپ احمد آباد
۲۵۔ اے پیارے لوگو	وارث علوی	۱۹۸۱ء	موڈرن پبلیکیشنز ہاؤس نئی دہلی
۲۶۔ تیسرے درجے کا مسافر	"	۱۹۸۱ء	امت پرکاشن جودھپور
۲۷۔ عکس دل	آمر سورتی	۱۹۷۸ء	آمر سورتی ۷/۱۸۳۵ سید پورہ ٹونکی سورت
۲۸۔ حالی مقدمہ اور ہم	وارث علوی	۱۹۸۳ء	اردو رائٹرس گلڈ۔ الہ آباد
۲۹۔ منزل تک	ظفر ہاشمی	۱۹۸۲ء	گلکا شاہ عالم احمد آباد
۳۰۔ کلام بیکل جونپوری	بیکل جونپوری	۱۹۷۲ء	سکریٹری بزم بیکل جونپوری احمد آباد نمبر ۱
۳۱۔ کائنات	بشیر احمد خاں زخمی دہلوی	۱۹۶۶ء	اشاعت اردو ہند، مکرانی پاڑا ملاڈ بمبئی
۳۲۔ جنگل کا راجا	اختر حسین اختر	۱۹۸۳ء	گلکا، شاہ عالم، احمد آباد
۳۳۔ کاسۂ سائنس	اقبال حسین	۱۹۸۳ء	" " " "
۳۴۔ حسن بلاغت	اختر حسین اختر	۱۹۸۵ء	مصنف خود، جمال پور، احمد آباد
۳۵۔ ہمارے شعراء	محمد یاسین	۱۹۸۵ء	" " " "
۳۶۔ شب نم	خلش بڑودوی	۱۹۸۵ء	یاقوت پورہ، بڑودہ
۳۷۔ سیپ	مرتب ظفر ہاشمی	۱۹۷۹ء	گلکا احمد آباد
۳۸۔ اس کے وجود کے نظارے قرآنی آیات کی روشنی میں		۱۹۸۳ء ۱۹۵۰ء	سید محمد حکیم الدین شیرازی احمد آباد
۳۹۔ میخانۂ غوث	فخر گجرات		
۴۰۔ خوشبو	عباس دانا	۱۹۸۵ء	حیدرآباد
۴۱۔ دھوپ چھایا اور میں	وقار واثقی	۱۹۸۵ء	رسول آباد شاہ عالم احمد آباد

اشاریہ

مرتبہ : غلام رازق

ن

و

ھ

میں محترم جناب شاہد علی خاں صاحب (جنرل منیجر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) کا مشکور ہوں کہ انھوں نے اس کتاب کی اشاعت میں خصوصی توجہ فرمائی نیز اپنی نگرانی میں اس کتاب کو زیورِ طبع سے آراستہ کیا۔۔۔

اس کتاب پر خرچ اندازے سے کچھ زیادہ ہی ہو گیا جس وقت کتابت ہو رہی تھی اس وقت ۔۔۔ "اشاریہ" "گجرات کے ادیبوں اور شاعروں کی مطبوعات کی فہرست" وغیرہ کا نقشہ ذہن میں نہ تھا۔ یہ سب بعد میں شامل کیا گیا اور اس طرح کتاب کے صفحات بڑھتے ہی چلے گئے۔ خطوط کے عکس کے علاوہ کچھ نایاب تصاویر ایسی تھیں جنھیں کتاب میں محفوظ کرنا ضروری تھا۔ اس سلسلے میں محترم شاہد علی خاں صاحب نے ذاتی دل چسپی لے کر ان تمام ضروری تصاویر کو کتاب میں محفوظ کر دیا اور خاکسار کو اس سلسلے میں عمدہ مشوروں سے نوازا بھی۔

جناب انوار احمد سریس والا، جناب معین۔ ایم۔ سریس والا اور جناب احسان جعفری (سابق ایم پی) میرے ایسے کرم فرماؤں میں ہیں جنھوں نے ہمیشہ میرے ساتھ علمی و ادبی کاموں میں امداد اور حوصلہ افزائی کی ہے اگر ان حضرات کا تعاون شامل نہ ہوتا تو کتاب میں مزید تاخیر ہو جاتی میں ان سب دوستوں کا شکر گزار ہوں۔۔۔

ایم۔ ایچ۔ سریس والا چیریٹیبل ٹرسٹ کا خصوصی طور پر ممنون ہوں کہ یہ ٹرسٹ ہمیشہ نیک اور بامقصد علمی و ادبی کاموں میں تعاون دیتا رہا ہے۔ زیر نظر کتاب میں بھی ایم۔ ایچ سریس والا چیریٹیبل ٹرسٹ کا تعاون شامل ہے نیز "گجرات اردو بورڈ" کے ذریعہ "ولی ایوارڈ" کی ابتدا بھی اسی ٹرسٹ نے کی ہے۔ یہ ایوارڈ سب سے پہلے ۱۹۸۵ء میں ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی کو دیا گیا۔ اللہ پاک بانیانِ ٹرسٹ کی عمر دراز کرے۔

رحمت امروہوی ۲۷ جون ۱۹۸۶ء احمد آباد